پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

سونامی کو آنے دو

ڈاکٹر اختر آزاد

پیش کش: اردوفکشن ڈاٹ کام

نام : اختر علی

قلمی نام : اختر آزاد

مقام پیدائش : شام پور، پیر پینتی، بھاگلپور (بہار)

والد کا نام : محمد حسین

والدہ کا نام : (مرحومہ) نجم النساء

تعلیم : پی ایچ ڈی، نیٹ

پہلی کہانی : 'علاج' ۱۹۸۵ء

کُتب : ☆بابل کا مینار (افسانوی مجموعہ۔ 2000)

☆ایک سمپورن انسان کی گاتھا (افسانوی مجموعہ ۔2005)

☆ہم کہاں جائیں...؟ (افسانوی مجموعہ۔ ہندی۔ 2007)

☆منظر کاظمی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ (تنقید۔ 2007)

☆سونامی کو آنے دو (افسانوی مجموعہ۔ 2011)

ترتیب : ☆جمشید پور کا اردو ادب

ایک شمارہ جمشید پور کے نام (''ہماری آواز'' 2006، سہ ماہی، میرٹھ)

آئندہ شائع ہونے والی کُتب ☆جھارکھنڈ میں اردو افسانہ

☆اردو افسانہ سمت و رفتار

☆برف پگھلے گی (افسانوی مجموعہ۔ ہندی میں)

اعزازت: ☆ایک سمپورن انسان کی گاتھا (بہار اردو اکاڈمی ایوارڈ۔2005) ☆ہم کلا ساہتیہ سمّان 2009 (ہماچل پردیش) ☆آنر آف شیلڈ، وائس چانسلر، میرٹھ یونیورسٹی کے ہاتھوں (2010)

☆منظر کاظمی: پرائڈ آف پرفارمینس ایوارڈ۔2011 ☆ادارہ ''شائقینِ ادب، اعزاز۔2011

گھر جنّت : نورالصّباح (اہلیہ) کائنات اختر (دختر) تابش اختر (فرزند)

پیشہ : درس و تدریس

شعبہ اردو، جواہر نوادیہ ودیالیہ۔ پوسٹ: بی کٹنگ، وایا۔ ٹاٹانگر،

سی جولتا، سرائے کیلا۔ 831002 (جھارکھنڈ)

رابطہ۔ DR. AKHTAR AZAD,ROAD NO.1,HOUSE NO-38

AZADNAGAR,JAMSHEDPUR-832110(JHARKHAND) MOB:9572683122

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

سونامی کو آنے دو

(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر اختر آزاد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© نورالصباح

TSUNAMI KO AANE DO

DR. AKHTAR AZAD

مرتّب :	منظر کلیم
سنِ اشاعت :	۲۰۱۱ء
تعداد :	پانچ سو
قیمت :	200/- روپئے
کمپوزنگ :	نورالصباح
سرورق :	ڈاکٹر ظفر گلزار، شعبہء اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ
مطبع :	

تقسیم کار

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,VAKIL STREET KUCHA PANDIT ,LAL KUAN DELHI- (INDIA)

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

ماں کبھی نہیں مرتی

والدہ نجم النساء

کے نام.....

جواب بھی زندہ ہیں

میری ہر کہانی میں

کہانی کے ہر لفظ میں

لفظ کے حرف حرف میں

کہ حرف کبھی نہیں مٹتے

لفظ کبھی نہیں کھوتے

کہانی کبھی نہیں مرتی

سب زندہ رہتے ہیں

ڈی این اے کی کوکھ میں

امّی!

آپ بھی زندہ ہیں

میری ہر کہانی میں

کہانی کی کہانی میں

ماں کبھی نہیں مرتی

حوّا آج بھی زندہ ہیں

☆

(دل کے آپریشن کے بعد ۱۱/ جولائی ۲۰۱۰ء کو والدہ محترمہ کا برہمنندہ نارائنہ ہردیالیہ، جمشید پور میں انتقال ہو گیا)

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

شعبۂ اردو

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

اور

ہفت رنگ کے

حسین امتزاج سے

چہار اطراف

اُردو کے قوس و قزح

تشکیل کرنے والے

میرے دوست

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

کے نام

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

فہرست

سونامی کوآنے دو...ایک جائزہ

ہندوستان میں افسانہ نگاری سے وابستہ لوگوں کی کمی نہیں۔ایک زمانہ تھا جب غزل گوئی اس حد تک بدنام ہوگئی تھی کہ اسکول کا ہر طالب علم غزلیں ضرور کہہ لیتا ہے، چاہے وہ ٹوٹی پھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ہر چند کہ اب بھی غزل گوئی دوسری صنفوں کے مقابلے میں زیادہ کی جارہی ہے۔لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب کے سب ریزہ ریزہ ہیں،جن کی کوئی اہمیّت نہیں۔افسانہ نگاروں کی بھی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔یہاں مجھے افسانے کے حوالے سے ایک بات ضرور کہنی ہے۔وہ یہ کہ آج کا افسانہ نگار رومانی ترنگ سے نکل چکا ہے۔ زندگی کے کھیل تماشے جو سطحی ہوتے ہیں ان سے اس کی وابستگی کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔وجہ یہ ہے کہ آج کا وقت بے حد Challenging ہے۔ہر شخص کے سامنے مختلف قسم کے مسائل کھڑے ہیں،ایسے میں وہ ہمیشہ غور وفکر کی راہ سے کوئی نہ کوئی پہلو نکالتا رہتا ہے کہ اس کی ذہنی تطہیر ہوسکے۔گویا آج کا افسانہ نگار ایک چھوٹا رزم نگار ہے جو زندگی کے جدال میں اپنی زندگی کی حفاظت میں محظوظ ہے۔اور زندگی کی حفاظت کا مفہوم وہ تمام انسانی اقدار ہیں جو جانوروں کا حصّہ نہیں ہیں۔کہہ سکتے ہیں کہ آج کا معمولی سے معمولی افسانہ نگار زندگی کے مسائل سے جوجھ رہا ہے اور اگر اس کے اندر کوئی فنکار موجود ہے تو پھر وہ ایسے صبر آزما مرحلے کو کہانی بنانے میں مصروف کار ہے۔

اختر آزاد نئے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ان کے دو افسانوی مجموعے''بابل کا مینار''
اور''ایک سمپورن انسان کی گاتھا'' قبل بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ہندو پاک کے مختلف رسائل
(ادبِ لطیف،تشکیل،سخنور،روشنائی،آج کل،ایوانِ اُردو،شب خون،شاعر،ذہنِ جدید،
ادب ساز،زبان وادب،مباحثہ وغیرہ) میں مسلسل لکھتے رہے ہیں اور گاہے گاہے اُن
کی پذیرائی بھی ہوتی رہی ہے۔لیکن مجھے جو چیز متاثر کرتی ہے وہ ہے زندگی کے پیچیدہ
مسائل سے اُلجھنا اور پھر اسے فنکارانہ طور پر ایک جہت دینا ــــــ اختر آزاد محض لکھنے کے
لئے نہیں لکھتے۔زندگی کے کھرے کھوٹے تجربے اور مشاہدے ان کے ذہن ودماغ میں رچ
بس جاتے ہیں۔خصوصاً جہاں استحصال کی کیفیت ہوتی ہے وہاں اُن کا قلم اور بھی چمکتا ہے
ظاہر ہے کہ ذہین افسانہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو اس
طرح فنّی جامہ پہنائے کہ پڑھنے والوں کے لئے بھی بصیرت کا کام سرانجام دے
سکے۔

''سونامی کوآنے دو'' ایک اچّھا مجموعہءافسانہ ہے۔جس میں زمانے کے احوال
وآثار سمٹتے نظر آتے ہیں۔ جہاں استحصال کی کیفیت رہتی ہے،اختر آزاد اس سے فوراً وابستہ
ہو جاتے ہیں۔اس وابستگی سے ان کا اپنا درد اور کرب نمایاں ہو جاتا ہے اور صالح اقدار کی
نمود سے ان کی افسانہ نگاری کی خاص روش سامنے آجاتی ہے۔''سونامی کوآنے دو'' جیسا
افسانہ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے اور رہنے کی سبیل
پیدا کرتے رہتے ہیں۔اس سلسلے میں اسی عنوان کے افسانے کا اقتباس دیکھئے:

''ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر غیر سرکاری دورے پر مسٹر کلین کو جانا ہوا۔اِس
دورے میں اُس کے ساتھ ایک ٹین ایجر لڑکی تھی جو اُس کی بیٹی سے بھی بہت چھوٹی تھی۔
ہیلی کاپٹر سمندر کے کنارے ایک عالی شان ہوٹل کے سامنے بنے ہیلی پیڈ پر اُترا ۔
اُس رات مجھے سامنے والے ہوٹل میں نہیں ٹھہرنا پڑا۔میں اُس وقت اُس کی اِس ادا پر حیرت
زدہ تھا کہ جب لڑکی اُس کے ساتھ ہے تو پھر اُسی کمرے میں مجھے ٹھہرانے کا جواز کیا ہے۔؟
لیکن اِس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا اُس نے میرے ہاتھ میں ویڈیو کیمرہ تھما دیا۔دوسرے

روز طے شدہ پروگرام کے تحت سمندری کناروں پر شوٹنگ ہونی تھی۔ پائلٹ کے بعد فوٹو گرافر کے طور پر میرا پروموشن ہوگا، یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وقت پر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ دونوں ایک سے ایک پوز بناتے رہے اور میں زاویہ تبدیل کرتا ہوا کیمرے کا لینس گھٹا تا بڑھاتا رہا کہ اچانک سمندری سائرن کی زوردار آواز فضا میں گونجنے لگی۔

میں نے دیکھا کہ سائرن کی آواز پر ساحلی مچھوارے سب کچھ چھوڑ کر زمینی سطح کی طرف بھاگنے لگے۔ سیر و تفریح کے لئے آئے لوگ بھی مچھواروں کے پیچھے پیچھے سمندر کے مخالف سمت دوڑنے لگے۔ اس دوران کچھ اونچے اونچے پیڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ پھر یکا یک لہروں کی ایک زوردار آواز اُبھری اور تیز ہوتی چلی گئی۔ تب کہیں جا کر یہ پتہ چلا کہ سمندری لہریں پاگل ہو اُٹھی ہیں اور ہزاروں کلومیٹر کی رفتار سے ساحل سے ٹکرانے آرہی ہیں۔ تب ہم سب بھی بھاگنے لگے۔ ہوٹل کے چاروں طرف ایک عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لہریں بڑھتی جارہی تھیں۔ لیکن یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس سے پہلے طوفانی لہریں ہیلی پیڈ تک پہنچتیں ہم تینوں ہیلی کاپٹر پر سوار ہو گئے تھے۔

جب میں نے ہیلی کاپٹر اسٹارٹ کیا اس وقت لہریں چکّے کو چوم رہی تھیں اور اب بس ہیلی کاپٹر زمین چھوڑنے ہی والا تھا کہ مسٹر کلین ایک زوردار لہروں کو اپنی جانب آتے دیکھ کر پاگلوں کی طرح چلّایا۔

''حرام خور.....جلدی اُڑان بھرو....جلدی کرو.....جلدی.....''

جب وہ پاگلوں کی طرح چلّا رہا تھا، اس وقت اونچی سر پٹکتی ضدّی لہریں بالکل نزدیک آ گئی تھیں۔ وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ ٹین ایجر لڑکی کے ساتھ ننگا چپکا ہوا تھا۔

اس پوز میں نہ جانے کیوں وہ آج مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے ہیلی کاپٹر کا اِسٹارٹنگ بٹن آف کیا اور ایک یادگار آخری تصویر اُتارنے کی لئے فوراً کیمرہ سنبھال لیا۔''

محسوس کرنے کی بات ہے کہ مسٹر کلین کیسا شخص ہے اور وہ زندگی کس طرح گزار رہا ہے ـــــ پھر اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ افسانہ نگار نے جس طرح ایک مختصر کینوس میں ایک بڑے موضوع کو سمیٹ لیا ہے، وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔

کہیں کہیں اختر آزاد نئے موضوعات کی تلاش بھی کرتے ہیں اور پھر اس کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ اسے برتنے کے لئے نیا انداز بھی اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس تیور کی کہانی '' نیا گھڑسوار '' ہے۔ لیکن یہ گھڑسوار عمومی نہیں بلکہ اس میں بہیمت ہے اور ایک طرح کی المنا کی صورتحال بھی........دراصل جنسی زندگی میں استحصال کی کہانی بہت پرانی ہے۔ لیکن پرانی باتوں کو بھی نیا طور طریق دے کر کیسے فن میں مزید ترفّع پیدا کیا جا سکتا ہے، وہ اختر آزاد جانتے ہیں۔ میں ایک مختصر سا اقتباس جو اس کہانی کا اختتامیہ بھی ہے، پیش کر رہا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ وہ بے حد پیچیدہ معاملات کو کس طرح افسانوی رنگ ڈھنگ دے کر ایک خاص تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تو اقتباس دیکھئے:

''سالی ـــــ! تم نے اپنا جسم کیسا بنا رکھا ہے کہ قبضے میں نہیں آتا۔؟ ''

دھیرے دھیرے کسے ہوئے زِین پر اس کے پاؤں کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ لگام ہاتھوں میں ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ مجبوراً اسے گھوڑی پر سے اُترنا پڑتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کاٹھ کی گھوڑی گوشت پوشت میں بدلنے لگتی ہے۔

گھڑسوار دوبارہ زین پر پاؤں رکھ کر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

....وہ روکتی ہے۔

''جانور اور پودے بھی اپنا دفاع کرتے ہیں۔ پھر میں تو انسان ہوں ـــــ تم نر ہو۔ طاقت ور ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم جب چاہو میرے منہ میں لگام ڈال دو۔''

''بگڑیل گھوڑی کو سدھانے کے لئے لگام لگانی پڑتی ہے۔''

''جس دن گھوڑی بے لگام ہو گئی اس دن......''

''وہ مجھے پٹک دے گی۔''

''اور جب ہڈّیاں ٹوٹیں گی تب سمجھ میں آئے گا کہ ناری کا درد کیا ہوتا ہے۔''

اس بات پر گھڑسوار اندر ہی اندر مسکرا اُٹھتا ہے۔ اور پھر اپنی لاچاری ظاہر کرتے ہوئے اُسے منانے کی کوشش کرتا ہے تا کہ اس پر دوبارہ زِین کَس سکے۔

''کیا کروں یہ ' درد ' بانٹا بھی تو نہیں جا سکتا....؟''

''بانٹا جا سکتا ہے۔''

''وہ کیسے.....؟''

''جیسے تمہارے اندر 'میں' اور میرے اندر 'تم' موجود ہو۔''

''نہیں! نر کے اندر صرف ' نر ' اور ناری کے اندر صرف ' ناری ' ہوتی ہے۔''

حالانکہ گھڑسوار نے اپنی طرف سے اس بات کو منوانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن کسی بھی قیمت پر گڑیا اُس کی بات ماننے کے لئے تیّار نہیں ہوئی۔ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اس بحث کے دوران وہ تکیہ کے نیچے سے کچھ نکالتی ہے۔ اُس وقت گھڑسوار کو اس کے جسم میں پہلے سے بھی زیادہ سختی محسوس ہوئی۔ اُس نے اندھیرے میں اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ کمر میں کچھ باندھ رہی ہے۔ پھر اُس کا سب سے اہم سِرا اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ یکا یک اُس کے اندر سنسنی سی پھیل گئی اور جسم خود بخود ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔

گھڑسواری کرتے کرتے وہ گھوڑا بن گیا۔ ''

گویا اختر آزاد فنّی رموز سے آگاہ ہیں۔ ان کے افسانے کا اختصار اور اس کی جامعیت خاص طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسا بھی لگتا ہے کہ وہ نت نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں تا کہ مکھی پر مکھی مارنے کا عمل سامنے نہ آئے اور ایسا محسوس نہ ہو کہ اس طرح کی چیز تو ہم بہت پہلے پڑھ چکے ہیں۔ دراصل موضوع تو کوئی نیا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور آج کی تھیوری تو یہ کہتی ہے کہ کوئی ادیب نہ تو کوئی موضوع پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی اختراعی مرحلے سے گذر سکتا ہے....اب کام بس اتنا رہ جاتا ہے کہ پرانے متون کو وہ نیا انداز

کیسے بخشے۔ اگر اس موقف کی تلاش کی جائے تو لازماً موضوعات کی تکرار ملے گی۔ لیکن فنکار اپنی جدّت سے اس طرح اسے فن کا جامہ پہنائے گا کہ وہ یقیناً تازہ بہ کار معلوم ہو گی۔ اختر آزاد اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں اور ان کے کئی افسانے کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ بس ابھی ابھی لکھے گئے ہیں اور موضوع بھی اچھوتا ہے۔

دراصل اختر آزاد اپنے آپ کو کھُلا رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ وہ کسی اسکول سے وابستہ ہو کر ویسے ہی موضوعات اختیار کریں، جو مخصوص مکتب کا ترجُمان ہو۔ لہٰذا ان کے یہاں جدّت کا ایک ایسا شعور ملتا ہے اور یہ بھی کہ ایسے شعور سے آج کے زمانے کے حسن وقبح کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ حسن کا کم قبح کا زیادہ ـــــ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان کے تمام افسانوں پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے۔ لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ میں بطور خاص چند افسانوں کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ جن سے ان کے تیور اور انداز کا بخوبی نشان ملتا ہے۔ ''شوٹ آؤٹ'' ''چھڑی'' ''وہیل چیر والی لڑکی'' ''گھر'' ''شُدّھی کرن'' ''زمینی نشیب وفراز کا کھیل'' ''کسان کے اجزائے ترکیبی'' ''رشتوں کی نئی اسکیم'' وغیرہ ..... یہ سارے افسانے متنوّع مزاج کے ہیں اور اس کا احساس دلاتے ہیں کہ فکر ونظر کے اعتبار سے اختر آزاد خاصی وسعت ذہنی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بعض افسانوں کا انجام اور اختتام بھرپور فنّی گرفت کا پتہ دیتا ہے۔ میں ذیل میں صرف تین افسانوں کے ابتدائیہ اور اختتامیہ جملے نقل کر رہا ہوں تاکہ اندازہ ہو کہ وہ کس طرح ان کے یہاں موضوعاتی طور پر ابتدا سے انتہا تک پہنچنے کی راہ متعیّن ہوتی ہے۔

''سر ان پہاڑی چوٹیوں پر صدیوں کی جمی ہوئی برف جسے آپ دیکھ رہے ہیں نا۔؟ وہ ایک دن میرے جسم کی گرمی سے پگھل جائے گی۔''

(ابتدا ـــ ''برف پگھلے گی'')

لو بزانگ گیاچو کی لاش کی تلاشی لی گئی۔ جیب سے بھوٹی میں لکھا دلائی لاما کے

نام کا ایک خط ملا ۔ جانچ کے بعد سیکورٹی کے اعلیٰ افسروں نے اُسے دلائی لاما کے پاس پہنچایا یا نہیں، یہ تو پتہ نہیں....لیکن سورج ڈوبنے کے بعد، پہاڑوں پر جمی صدیوں کی برف کو اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ چینی دہشت گرد کی شناخت کرنے والا شخص کوئی اور نہیں لو بزانگ گیا چو کا بڑا بھائی تھا، جسے اُس کے دوسرے بھائی نے لو بزانگ گیا چو کی موت کی سازش رچنے کے جُرم میں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

نئے 'کال چکر' کی اس گرمی سے صدیوں کے 'گلیشیر' کو تو پگھلنا ہی تھا۔

(اختتامیہ —''برف پگھلے گی'')

''اگر تم سب سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔ یا پھر گھر لوٹ آؤ۔ شُدّھی کرن کا کام جاری ہے۔ پھر نہ کوئی تمہیں ملیچھ کہے گا اور نہ کوئی تمہیں یہاں سے جانے کے لئے ہی کہے گا، کیوں کہ تب ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔''

(ابتدا —''شُدّھی کرن'')

''دوستو!

اب وہ شُبھ گھڑی آ گئی ہے۔ میں شُدّھی کرن کے لئے ایک ایسی عورت کو آواز دے رہا ہوں جس کے پتی کو دھرم کے نام پر دس سال پہلے میں نے اسی خنجر سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔'' کمر سے دھاردار ترشول نما خنجر نکال کر ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے آگے کہا۔'' آج اس کی پتنی کی باری ہے۔ وہ جلد سے جلد منچ پر آئے۔''

عورت کو منچ پر آتے دیکھ کر مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پانڈے مسکرا رہا تھا۔ پھر یکا یک ایک زوردار ہوا کا جھونکا آیا اور منچ پر لگا ہوا زعفرانی جھنڈا زمیں پر آ گرا۔ پانڈے اور پانڈے جیسے لوگوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مجمع مبارک باد دینے کے لئے منچ پر ٹوٹ پڑا۔ فوٹو گرافروں نے کیمرہ سنبھال لیا۔

سنگھٹن کے ادھیکچھ نے اس عورت کے ہاتھوں خود اپنا شُدّھی کرن کروالیا تھا۔''

(اختتام —— ''شُدّھی کرن'')

''بریکنگ نیوز.....

''ملک کے سب سے اہم شہر کے اہم مقامات پر سینکڑوں خود کش بم باروں نے ایک ساتھ کئی اہم دھماکے کئے۔ جس میں ہزاروں بے گناہ انسان مارے گئے۔......ابھی تک کسی دہشت گرد تنظیم نے اس کی ذمّہ داری نہیں لی ہے۔''

(ابتدا ـــــ''ریموٹ کنٹرول'')

''میں آج بہت خوش ہوں کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔لیکن ساری پلاننگ تو آپ کی تھی۔ میں تو صرف آپ کے حکم کا مہرہ تھا۔اس لئے ہزاروں انسان کی روحوں سے جڑے اس تمغے کا اصل حق دار تو تم ہوا علیٰ کمان!

تمغہ منہ پر پھینکا اور کمر میں بندھے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔

(اختتام ـــــ''ریموٹ کنٹرول'')

اختر آزاد اپنے رواں اسلوب کی وجہ سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ان کے افسانے میں کوئی ایسی بات نہیں جو اس سے اٹوٹ طور پر متعلّق نہ ہو۔گویا ان کے یہاں Compactness ہے۔ایک جُز سے دوسرے جُز تک پہنچنے کا فنّی شعور بھی ہے اور کہانی کو اختتام تک لے جانے کی تکنیکی صورت بھی ہے۔کہہ سکتے ہیں کہ ''سونامی کو آنے دو'' کے اختر آزاد ایک اچّھے افسانہ نگار ہیں،جن کی صف ابھی متعیّن نہیں کی جاسکتی۔لیکن بڑے امکانات کی خبر ضرور ملتی ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی
ہارون نگر،سکٹر ۔۲
پھلواری شریف، پٹنہ

شوٹ آوٹ

''افزائشِ نسل کے لئے بھی حکومت سے لائسینس لینا ہوگا۔''
جب بڑھتی ہوئی آبادی دنیا کے لئے مسئلہ بن گئی، تب دنیا کے تمام مما لک نے یہ فیصلہ کیا کہ جب چھوٹے چھوٹے معاملات میں قانون کا دخل ہے تو پھر آبادی جیسے اہم مسئلے پر کوئی ٹھوس قانون کیوں نہیں۔؟ جب کہ بڑھتی آبادی کے دباؤ اور کساد بازاری (RECESSION) نے دنیا کے معاشیاتی نظام کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر اس پر ابھی سے کنٹرول نہیں کیا گیا تو ایک دن کھیتوں کی جگہ سمنٹ کے جنگل ہوں گے اور لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں گے۔
.....اور پھر متفقّہ طور پر یہ تجویز پاس ہوگئی کہ بچّے کے لئے بھی لائسینس لینا ہوگا۔ اور یہ اُن شادی شدہ جوڑوں کو ملے گا جو اِن شرائط کو پورا کریں گے۔
☆ جن کے پاس اپنا گھر ہو۔
☆ بینک میں دس لاکھ روپئے ہوں۔ (جسے حکومت بچّے کی تعلیم پر خرچ کرے گی)
☆ جانچ میں اگر نتیجہ لائسینس کے برعکس آیا تو ابارشن کروانا ہوگا۔ ابارشن نہیں کروانے کی صورت میں دوبارہ لائسینس فیس جمع کرنا پڑے گی۔
☆ مالیت کے حساب سے لائسینس دئے جائیں گے۔ یعنی ایک کروڑ مالیت

والے کو دس لائسنس ملیں گے۔ دس سے زیادہ کسی کو ایشو نہیں ہوگا۔ اگر دس میں سے انہیں دو ہی بچّے چاہئے تو آٹھ لائسنس کینسل کروانے ہوں گے۔ جس کے لئے بیس فی صد فائن دینا ہو گا۔ جس کا فائدہ اُنہیں سالانہ ریٹرن فائل کرتے وقت ٹیکس میں ری بیٹ کے طور پر ملے گا۔

لائسنس اور اس سے جڑی دوسری اہم باتیں میڈیا کے ذریعہ گھر گھر پہنچتی رہیں۔

☆ شادی کے ایک ماہ کے اندر لائسنس کا رجسٹریشن کروانا ہوگا۔

☆ لڑکا اور لڑکی کا تناسب بغیر کسی ذات پات، زبان، رنگ اور نسل کے ہر علاقے میں برابر برابر رکھا جائے گا۔

☆ کسے لڑکا اور کسے لڑکی کا لائسنس دیا جائے گا اس کا فیصلہ حکومت مردوزن کی تعداد کو دیکھ کر کرے گی ۔

☆ پر گنینسی کنفرمیشن کی اِطّلاع ایک ماہ میں حکومت کو دینی ہوگی۔ ☆ بچّوں کے نام نمبر شمار اعداد اور حروف تہجّی کی مناسبت سے رکھے جائیں گے۔

☆ لڑکی ر لڑکا کا رجسٹریشن الگ الگ ہوگا۔ 001B لڑکا کا اور 001G لڑکی کا۔ یعنی یہ رجسٹریشن نمبر ہی ان کی شناخت کا باعث ہوگا۔ اُنہیں دونوں کو آپس میں شادی کرنے کی اجازت ہوگی۔ ماں باپ کسی بھی قیمت پر مذہب کی آڑ یا پھر کوئی اور بہانہ بنا کر اس کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ اگر کسی وجہ سے دو جوڑے آپس میں میو چول کرنا چاہیں تو حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف میو چول لائسنس فیس کی پچاس فی صد رقم الگ سے جمع کرنا پڑے گی۔ کسی بیماری یا حادثے کے شکار ہونے والے جوڑے کے لئے معقول جوڑے کی تلاش حکومت کے ذمّے ہوگی۔ چور دروازے سے داخل ہونے والے غیر لائسنسی بچّوں کو نہ ہی شادی کی اِجازت ہوگی اور نہ ہی اُنہیں کسی طرح کی سرکاری نوکری یا رعایت ہی ملے گی۔ اُن کا مالکانہ حق حکومت کے پاس ہو گا۔ بغیر لائسنس بچّہ پیدا کرنے کے جُرم میں ماں باپ کو دُگنا فائن یا دس سال کی

سزا یا پھر دونوں کا سُکھ ساتھ ساتھ بھوگنا ہوگا۔

☆

مذہبی پیشواؤں نے اس قانون کی جم کر مخالفت کی۔ حکومت کے خلاف لوگوں کو سڑکوں پر اُتارا۔ آسمانی قہر سے ڈرایا، دھمکایا کہ خدائی قانون سے بڑا کوئی قانون نہیں۔ حکومت ہوش میں آئے اور لائسینس بل واپس لے۔ لیکن حکومت نے اس کے جواب میں پیشواؤں کو ملنے والی مراعات وسہولیات کو ایک ایک کر کے واپس لینا شروع کر دیا۔ اور یہ حکم جاری کیا کہ جو بھی بھیڑ کا حصّہ بنے گا اُسے لائسینس سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ پھر کیا تھا۔؟ دھیرے دھیرے بھیڑ کم ہونے لگی۔ پیشواؤں کے اندر کا جوش جو ایک وقت ان کی آواز میں اُبال مار رہا تھا۔ یکا یک جھاگ بن کر گلے میں بیٹھ گیا۔ اس لئے ان کی آواز مدّھم پڑتی چلی گئی

اپوزیشن نے بھی بہت ہنگامہ کیا کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور کساد بازاری تو صرف ایک بہانہ ہے۔ دراصل اس بہانے حکومت لائسینسی آلہء تناسل سے سرکاری خزانے کو پر گنینٹ پر پر گنینٹ کرنے کا کام کر رہی ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ جب چاہیں اس کہ پھولے ہوئے پیٹ پر سر رکھ کر عیش کی نیند سو سکیں۔ لیکن اس ہنگامے نے واقعی حکومت کی نیندیں اُڑا دیں۔ بوکھلاہٹ میں حکومت نے اُن کے نیتاؤں کے پُرانے کیس کھول دیئے۔ کئی کو جیل میں ڈال دیا۔ کچھ کو ڈرا دھمکا کر، کچھ کو پیسے کا لالچ دے کر اور کچھ کو منسٹری کا راستہ دکھا کر اپنی پارٹی میں شامل کر لیا —— پھر ہونا کیا تھا: اپوزیشن کے دوسرے نیتا بھی جیل اور کورٹ کے چکّر سے خود کو بچانے میں لگ گئے۔

سرکار کے فیصلے کے خلاف غریبوں نے احتجاج کا بگُل بجا دیا کہ وہ دس لاکھ کہاں سے لائیں گے۔؟ لائسینس نہیں بننے کا مطلب نسل کا خاتمہ۔ نسل کی حفاظت کے لئے غریبوں نے جاں توڑ محنت کی۔ اوور ٹائم پر اوور ٹائم کیا۔ ایماندار بھی صحیح غلط کا فیصلہ کئے بغیر آنکھ بند کر کے دولت کی حصولیابی میں جُٹ گئے۔ ان دنوں غریب لڑکوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ لڑکی دینے سے پہلے ماں باپ سو بار سوچتے تھے۔ اس لئے غریب گھرانے سے رشتے آتے ہی

وہ اُنہیں لائسینس کے ترازو میں تولنے کے لئے لفظوں کا بٹکھرا لئے سامنے آجاتے تھے۔

''لائسینس خریدنے کی جب اوقات نہیں ہے تو پھر کیا میں اپنی بیٹی کو تمہارے گھر جھولا جھولنے کے لئے بھیجوں۔؟''

غریب لڑکیاں بھی ماں باپ کی عزّت کی خاطر پہلے سب کچھ سہ جاتی تھیں۔ لیکن اس قانون نے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر' ماں ' جیسے حسین بول سننے کے لئے ان کے کان ترس گئے تو....؟ تو پھر وہ اپنی کوکھ کو کیا جواب دے گی۔اس سے تو اچّھا ہے زندگی بھر کنواری رہنا....ایسے میں بے چارے غریب لڑکے جب کسی لڑکی کو دامِ اُلفت میں پھانسنا چاہتے تو وہاں بھی اس کا سامنا ذِلّت ورُسوائی سے ہوتا۔

''دیکھو مسٹر! میں آپ کی حیثیت جانتی ہوں۔ مجھے ہر حال میں' ماں' بننا ہے۔لائسینس چوری کر کے بنوائیں گے یا ماں کے زیور بیچ کر....خبردار! جو دوبارہ راستہ روکنے کی جُراُت کی۔''

☆

غریبوں کی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے دنیا کے تمام ممالک نے اپنے اپنے قانون میں' سب سیڈی' کی گنجائش رکھی ہے ــــ اس قانون کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے غریبوں نے لائسینس میں بھی سب سیڈی کی مانگ کر دی۔سب سیڈی دینے کا مطلب پھر ہر جگہ وہی غریبی، وہی بے روزگاری، وہی جھونپڑ پٹّی ....اِس لئے حکومت نے ان کی بات نہیں مانی۔غریبوں کو لگا کہ اِس بہانے حکومت غریبوں کو ختم کرنے کی ناپاک سازش رچ رہی ہے۔اس لئے انہوں نے روڈ جام، ہڑتال اور توڑ پھوڑ کے ذریعے حکومت کو چاروں طرف سے گھیرنے اور اس پر دباؤ بنانے کی کوشش ہے۔

''سب سیڈی ہمارا حق ہے۔اگر حکومت نے دینے سے انکار کیا تو ہم سب لاکھوں کی تعداد میں اسمبلی کے سامنے خودکشی کر لیں گے۔''

غریب یونین کے صدر کی اس دھمکی کے بعد جوش میں ہوش کھونے والے دو چار جوڑوں نے اِجتماعی خودکشی بھی کی۔حکومت ٹُس سے مَس نہیں ہوئی۔لیکن ذات کی بنیاد پر بنی تنظیموں کے آگے حکومت کو اُس وقت جھکنا پڑا جب انہوں نے پورے ملک میں صفائی کا محکمہ

ٹھپ کر دیا۔ ہر طرف گندگی، سڑاندھ، تعفّن۔ اس سے حکومت کا دم گھٹنے لگا۔ آخر کار حکومت نے ۷۵ رفیصد 'سب سیڈی' کا اعلان کر دیا ــــ اب انہیں لائسینس کے لئے صرف ۲۵ رفی صدر قم ہی جمع کرنا تھی۔ مہنگائی کے دور میں ۲۵ رفی صدر قم بچّے کی اعلیٰ تعلیم کا بار نہیں اُٹھا سکتی۔ اصولاً حکومت کو چاہئے تھا کہ سب سیڈی کی اس رقم کو بچّے کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرتی ۔ لیکن پالیسی میکرز جو اونچی ذات والے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ چھوٹی ذات والے کبھی اُن کی برابر کی کرسی پر بیٹھیں۔ اس لئے پالیسی بناتے وقت ۲۵ رفی صدر قم کو تعلیم کے لئے مختص کیا گیا۔ اور سب سیڈی والی ۷۵ رفی صدر قم کو تعلیمی خرچ سے الگ، حکومت کی تحویل میں 'فلاحِ عامّہ' کے لئے رہنے دیا گیا، کہ سب پڑھ لکھ لیں گے تو 'گندگی' کون اُٹھائے گا۔؟

جہاں غریب لائسینس کی حصولیابی کے لئے دن رات محنت، محنت اینٹ جوڑ کر دولت کی عمارت تعمیر کرنے میں لگے ہوئے تھے، وہیں کچھ دولت مند حضرات لائسینس منسوخ کروانے کے لئے وکیلوں سے رائے مشورے کر رہے تھےــــ لیکن کچھ عیش و عشرت کے دلدادہ امیرزادے جو روزانہ نائٹ کلب میں کاندھا بدلنے کے شوقین تھے، وہ حکومت کے اِس فیصلے سے خوش تھے اور اس بہانے اپنی اپنی بیویوں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ لائسینس منسوخ کروانے میں جتنے پیسے لگیں گے، اتنے سے کم میں تو وہ کسی من چاہی سندری سے شادی رچا کر اس کی زندگی بھر کا خرچ اُٹھالیں گے۔ گھر کے کاموں میں وہ مدد بھی کرے گی اور دو چار بچّوں کے آنے سے فائن کے پیسے بھی بچیں گے۔

دنیا کی کوئی بھی بیوی ایسی مدد کے لئے کبھی تیّار نہیں ہوگی ۔ کیونکہ عورت زمانے کے سارے دُکھ جھیل سکتی ہے، لیکن ہزاروں سُکھ کے ساتھ سوتن کی حصّہ داری کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے ہر سال اپنی کوکھ کو داؤں پر لگا دیتی ہے

''دیکھئے اگر پیسہ ہی بچانا ہے تو میں ہر سال خود کو پرِ گنینٹ کروانے کے لئے تیّار ہوں۔''

''لیکن ڈارلنگ تمہارے فیگر کا کیا ہوگا۔؟''

دوسری طرف چند ایک عورتیں اس قانون کے آتے ہی اپنے فیگر کو لے کر پریشان

ہو گئیں۔ کیوں کہ ان کے شوہر فائن دینے کے بجائے زیادہ سے زیادہ لائسینس کا استعمال کر لینا چاہتے تھے۔لیکن ان کی بیویاں اس حق میں نہیں تھیں۔

''میں کوئی مشین نہیں کہ تم جب چاہو بٹن دبا کر بچّہ برآمد کرلو۔''

☆

لائسینس فارم کی خانہ پُری میں لوگوں کو کئی کئی دفتروں کے چکّر لگانے پڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں کو گھوس دینا پڑ رہا تھا۔اس خوف سے کہ کہیں جان بوجھ کر وہ ایسی ویسی بیماری نہ نکال دیں،جس کے مُضر اثرات فارم پر پڑیں اور وہ کینسل ہو جائیں۔

بجلی کا انتظام کیسا ہے۔؟ واٹر سپلائی کیسی ہے۔؟ گھر ڈرائنگ کے مطابق ہے یا نہیں۔؟ اس کے علاوہ کئی اور محکموں سے لوگوں کو اُلٹے سیدھے کاغذات بنوانے پڑ رہے تھے۔ اِنسٹنٹ آپریشن کرنے والے چینلوں کو بھی اس کی خبر تھی۔لیکن اس کے رپورٹر بھی دفتروں کے آگے خفیہ کیمرے کے بجائے فائل لئے کھڑے تھے۔اس لئے دفتری بابو بے خوف ہو کر اپنا ہُنر بیچ رہے تھے۔

''جناب! شیشے کے اُس پار آپ دھوپ میں اِس طرح کب تک کھڑے رہے گیں۔؟ آپ تو سمجھدار لگتے ہیں۔اندر آئیں اور آرام سے بیٹھیں ـــــ آمنے سامنے بیٹھنے سے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔''

اور ایسا ہوا بھی ـــــ بابوؤں کے ایک اشارے نے بڑے بڑے مسئلے حل کرا دئے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ٹرانس پیرنٹ لفاف میں لائسینس کے ساتھ بچّہ تک پیک کر کے ضرورت مندوں کے گھر بھیجوا دیتا۔''

☆

ایک سال کی قلیل مدّت میں لائسینس کے کاروبار نے سرکاری خزانے کو سونے چاندی سے بھر دیا تھا۔جس کی بدولت حکومت نے عالمی بینک کہ وہ سارے قرض جسے اُتارنے میں کم سے کم پندرہ سے بیس سال لگ جاتے ،اُسے یک مشت اُتار دیا تھا بہت سارے وہ غریب جو لائسینس بنوانے کے لئے بینک سے خوشی خوشی لون لئے تھے،

لیکن جب قرض اُتارنے کی باری آئی تو اِن میں سے کئی ایک کی زندگی کی گاڑی قسط کی پٹری سے ایسی اُتری کہ دوبارہ کبھی چڑھ نہ سکی۔

وقت گذرتا رہا۔ لائسینسی بچّے بڑے ہوتے رہے۔ بڑے ہوتے ہوتے جب وہ واقعی بڑے ہو گئے تو اس میں سے کچھ نے حکومت کے خلاف مقدمہ درج کر دیا ——"میں کوئی بے جان شئے نہیں کہ کوئی میری مرضی کے بغیر میرا لائسینس جسے چاہے دے دے۔" کئی سال تک یہ کیس چلا۔ لیکن عدالت نے لائسینس کے قانونی پروسیس کو صحیح ٹھہراتے ہوئے لائسینسیوں کے خلاف فیصلہ سُنا دیا۔ لیکن اس کے بعد بھی لائسینسیوں نے ہمّت نہیں ہاری۔ اور ایک دوسرا مقدمہ ٹھونک دیا۔"جب تک وہ چھوٹے تھے اُن کے پاس تھے جن کے پاس اُن کے ہونے کا لائسینس تھا ۔لیکن اب جب کہ وہ بڑے ہو چکے ہیں تو انہیں اُن کی مرضی کے ماں باپ چننے کا لائسینس دیا جائے۔اور ساتھ ہی ساتھ لائسینسی بچّوں کے بچّوں کی لائسینس فیس ختم کی جائے۔ کیونکہ وہ تو پیدائشی لائسینسی ہیں ——" لیکن لائسینسیوں کی ان باتوں کو مان لینے سے ہر طرف افراتفری مچ جاتی۔ ہر کوئی ماں باپ کے لئے امیرا اور شہرت یافتہ کا ہی انتخاب کرتا۔ آپس میں خون خرابہ ہو جاتا۔ اور لائسینس فیس ختم کر دینے سے مندی کے اس دور میں سرکاری خزانے کو بھرنے کا یہ نایاب طریقہ حکومت کے ہاتھوں سے نکل جاتا۔ سرکاری پیسوں سے جو عیش اب ہو رہا تھا اسے کون کھونا چاہتا۔ اس لئے حکومت نے عدالت کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کر کے انہیں اپنی طرف کر لیا۔

لائسینسیوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کی باتوں کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو اُنہوں نے ایک آخری چال چلی اور موت کے لائسینس کے لئے اَپلائی کر دیا کہ کم سے کم موت پر اُن کا ادھیکار ہو۔ کہاں مرنا ہے۔؟ کس طرح مرنا ہے۔؟ کب مرنا ہے۔؟ اور مرنے کے بعد اُن کے جسم کے ساتھ کیا ہونا ہے۔؟ یہ سب اُن کے اختیار میں ہوں۔ سرکار نے ان کی یہ گزارش مان لی۔ اِس شرط کے ساتھ کہ موت کے لائسینس بنوانے والے کو بچّے کا لائسینس نہیں ملے گا۔ جنہیں مل گیا ہے اُنہیں کینسل کروانا ہوگا۔ اور

جن کے بچّے اِس دُنیا میں آ گئے ہیں اُنہیں اپنے بچّوں کو سرکار کے حوالے کرنا ہوگا۔

اس شرط کی مخالفت میں چند لاشیں گریں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا۔ کیوں کہ لوگ مر کے بھی جینا چاہتے ہیں۔ جینے کے لئے نئی نسل کا لائسنس ہونا ضروری ہے۔ تبھی وہ لاکھوں کروڑوں سالوں تک نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے نئی نسل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

☆

وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لائسنسی بچّوں کے بچّے بھی اِس دنیا میں اپنے ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اب سرکار پوری طرح سے لائسنسی بچّوں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ چاہتے تو ایک نیا بل پاس کر کے لائسنس کے قانون کو ختم کر سکتے تھے۔ حالانکہ اپوزیشن نے آواز اُٹھائی تھی۔ لیکن وہ چاہ کر بھی اسے ختم نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ سب عیش کی دلدل میں بہت اندر تک دھنسے ہوئے تھے۔ جہاں سے باہر نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اگر وہ طاقت بھی لگاتے تو باہر آنے کے بجائے اندر ہی اندر دھنستے چلے جاتے —— اب تو قانون میں پہلے سے بھی زیادہ سختی برتی جانے لگی تھی۔ سرکاری خزانہ قارون کے خزانہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس لئے سرکاری دفاتر میں عیش بھی دُگنا ہو گیا تھا —— لوگ سرکار کے اس رویّے سے پریشان تھے۔ اِس پریشانی میں ایک اور پریشانی اس وقت لوگوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی جب پیسے کے لالچ میں اندھی ہوئی حکومت نے پارٹی میں مخالفت کے باوجود لائسنس کے متعلق ایک نیا قانون مجلسِ قانون ساز میں پاس کر دیا۔

''اب افزائشِ نسل قانون کے تحت لائسنس کی ویلیڈیٹی (VALIDITY) ساٹھ سال کر دی گئی ہے۔ اگر ساٹھ سال کے اندران کے بچّے رینیول (RENEWAL) نہیں کرواتے ہیں تو اُنہیں بے کار سم (SIM) سمجھ کر ڈسٹ بین میں ڈال دیا جائے۔

حکومت کی طرف سے اِس قانونی فرمان کے جاری ہوتے ہی ساٹھ سال کی عمر کو چھوتے ہوئے بوڑھوں کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی۔ ہر گھر میں دو بوڑھی آنکھیں ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ایک بوڑھی آنکھ نے دوسری بوڑھی آنکھ کی آنکھ میں

آنکھ ڈال کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اُمید بندھانے کی کوشش کی۔
''تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُسے سب معلوم ہے کہ ہم نے اس کے لائسینس کے لئے اپنی جوانی کے پانچ سال آگ کی بھٹّی میں جھونکے ہیں۔ ڈاکٹر نے تمہاری بیماری کو دیکھتے ہوئے 'ماں' بننے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن تم نے اپنی ضد کے آگے ڈاکٹر کی ایک نہیں مانی۔ یہ الگ بات ہے کہ تم موت سے جیت گئیں۔ اگر اُس دن تمہیں کچھ ہو گیا ہوتا تو.....؟'' جھرّی بھرے ایک ہاتھ نے دوسرے جھرّی بھرے ہاتھ پر آہستے سے ہاتھ رکھا اور آگے کہا ـــ ''تمہارے بیٹے کے پاس آج کیا نہیں ہے۔ ری نیول تو اس کے بائیں ہاتھ کا میل ہے۔ اس سلسلے میں بہو کے ساتھ بات کرتے ہوئے میں نے بابو کو دیکھا ہے۔ وہ بھی پریشان لگ رہا تھا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ سب دیکھ لے گا۔ اسے بھی تو ہماری فکر ہوگی۔ تم دیکھنا وہ پہلے سے لائسینس ری نیول کروا کر کے گھر میں رکھ دیا ہوگا۔ سرپرائز دینے کی ہمیشہ سے اُس کی عادت جو ہے۔

وقت بھی ہر لمحہ سرپرائز دیتا رہتا ہے۔ دنیا کے سارے ماں باپ اس اُمید پر جیتے ہیں کہ زمانہ جتنا بھی خراب ہو جائے۔ کساد بازاری (RECESSION) کسی حد تک پہنچ جائے لیکن اُس کی اولاد کبھی اپنے ماں باپ کو موت کے کنویں میں نہیں ڈھکیل سکتی ۔ اس لئے ری نیول سے متعلق ہر طرف سوچ کا عمل جاری تھا اور اس عمل میں ہر کوئی نفع نقصان کی سوچ رہا تھا ۔

لائسینسی تہذیب کے پروردہ بچّوں کے ایک ایسے ہی کمرے میں شادی کی پہلی رات ریسیشن کے بستر پر ایک نئی نویلی دُلہن اپنے اُداس پاؤں سمیٹے بیٹھی تھی۔
''ڈارلنگ تم نے وہ ری نیول والی خبر پڑھی۔؟''
''ٹی وی پر دیکھا ہے۔ لیکن آج کی رات تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔''
''پریشان کیوں نہ رہوں۔ کل جب بچّے ہوں گے تو اُس کی پڑھائی اور گھر کے دوسرے کاموں میں کتنا خرچ ہوگا۔ آپ نے کبھی سوچا ہے۔؟ اور آج پہلے ہی دن یہ

ری نیول والا جھنجھٹ....'' وہ رونے لگی تھی۔ شوہر نے آنسو پوچھنے لئے جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بولی ـــــ ''ڈارلنگ! عقل سے کام لو۔ میری سہیلیاں کہہ رہی تھیں کہ جتنے میں ری نیول ہوگا اتنے میں تو نیا لائسینس بن جائے گا۔''

☆

ساٹھ سال پورا ہونے سے پہلے حکومت نے افزائشِ نسل رجسٹر کاؤنٹر کے سامنے ری نیول کاونٹر کھُلوا دیا۔ حکومت کو اُمّید تھی کہ اتنی بھیڑ ہوگی کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے لئے الگ سے ری نیول ٹاسک فورس بنائی گئی تھی۔ اور اسے ایک خاص وقت کے لئے ایک خاص طرح کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔

جس دن ساٹھ سال ہوا، اس دن بھی ایک ہی کاؤنٹر پر لوگوں کا ہجوم تھا ـــــ دوسرا کاؤنٹر خالی تھا۔

دوسرے دن ری نیول ٹاسک فورس کی طرف سے شوٹ آؤٹ کا عمل جاری ہوگیا۔

بچّے ایک یادگار تصویر کے لئے بالکونی میں موجود تھے۔

☆

سونامی کوآنے دو

میں نے جب تک سمندری قبرگاہ میں اپنے اس خدا کو اُتار کر لہروں سے ڈھک نہیں دیا،اس وقت تک سمندر نے مجھے قبول نہیں کیا۔

وہ یقیناً میرا خدا تھا۔اس نے مفلسی کی غلاظت سے نکال کر میرے سر پر امیری کا تاج رکھا تھا۔جس کی تمنّا میں نے نہیں کی تھی۔لیکن اس روز جب اچانک سمندری لہریں پاگل ہو اُٹھی تھیں اور میں اپنے خدا کو بچا سکتا تھا،نہ جانے کیا ہو گیا کہ میں لہروں کی اونچائیوں کو کیمرے میں قید کرنے اور اس کے استقبال میں اتنا محو ہو گیا کہ میرا خدا مجھ سے جُدا ہو گیا۔

نام اُس کا کیا تھا کسی کو نہیں معلوم۔لیکن سب اسے مسٹر کلین کے نام سے جانتے تھے۔چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد،گوری رنگت،سفید سلجھے ہوئے بال،پُرکشش آنکھیں اور باتوں میں اس کی بلا کا جادو تھا۔دُھلے دُھلائے سفید لباس اس کی شخصیّت میں چاند ستارے ٹانکنے کے لئے کافی تھے۔کوئی بھی ایک نظر دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔غریبوں کا مسیحا اور امیروں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ہر کسی کو خوش رکھنے کا ہُنر وہ جانتا تھا۔ضرورت کے وقت وہ ہر کسی کے کام آتا۔یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس پر بُرا وقت آیا،ہر کسی نے اُسے کلین چٹ دے دی۔اس طرح روز بہ روز اس کی ترقّی کا گراف اوپر اُٹھتا رہا اور وہ مسٹر سے مسٹر کلین بن گیا۔

پیدا تو وہ جھونپڑپٹّی میں ہوا تھا۔لیکن آہستہ آہستہ ساری جھونپڑپٹّی اس کی ہو گئی۔ پہلے ایم ایل اے بنا اور پھر ایک ہی جھٹکے میں منسٹر ہو گیا۔جھونپڑپٹّی سے ایم ایل اے کے سفر کے دوران اپنا مٹ میلا لباس تبدیل کر کے دودھ میں ایسا دھلا کہ سفید لباس اس کے وجود کا حصّہ بن گیا۔پھر کیا تھا؟ کرسیوں پر بیٹھے سفید پوشوں نے اس کی اس قابلیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے عزّت کے سارے ستارے اس کے کاندھے پر ایک ایک کر کے ٹانک دیئے۔

مجھے وہ خود جھونپڑپٹّی سے اُٹھا کر لایا تھا۔دوستی کا فرض نبھانا اسے خوب آتا تھا۔ میرا گھر گھر گھومنا، مانگنا، اور بچا کچا کھانا کھانا اس کو پسند نہ تھا۔اس لئے ایک دن اس نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔کچھ ہی دنوں میں یہ مانگنے کھانے والا ایک خوبصورت کار کا ڈرائیور بن گیا۔ یہ ایم ایل اے بننے سے پہلے کی بات ہے۔ایم ایل اے کے بعد جیسے جیسے اس کا قد اونچا ہوتا گیا، میں بھی ترقّی پر ترقّی کرتا گیا۔منسٹر بنتے ہی اس کے ذاتی ہیلی کاپٹر کا پائلٹ بن گیا۔

وہ تھا تو انگوٹھا چھاپ۔لیکن ایم ایل اے بننے کی چاہت میں اس نے کئی رِم کاغذ برباد کئے۔دستخط کرنا کیا سیکھا کہ شہر کے تمام کالجوں کی سربراہی اس کے ہاتھوں میں چلی آئی۔ پھر کالج کے تمام فیصلے اس کے دفتر میں ہونے لگے۔اسٹوڈنٹ کے داخلے سے لے کر لکچرر، ریڈر اور پروفیسر کے سلیکشن میں بھی اس کا اہم رول ہوا کرتا۔جس کی سفارش وہ کر دیتا اس کی نیّا پار ہو جاتی، اور جس کی نیّا وہ پار کرتا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی گڈ بُک میں آجاتا۔اور اس سے جب چاہتا من مانی کرواتا۔انتظامیہ اور یونین کے لیڈروں کو کبھی اپنی طاقت، کبھی اپنے اثر رسوخ، اور کبھی تحفے وغیرہ دے کر اپنی جیب میں رکھتا۔ایک بار کالج کے ایک پرنسپل نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کی غلطی کی تھی اور مسٹر کلین نے ہمیشہ کے لئے اسے ہی اٹھا دیا۔شواہد کی موجودگی میں وہ پولس کی گرفت سے آزاد رہا۔اس کی اس نمایاں کارکردگی کو دیکھتے ہوئے چیف منسٹر نے اسے وزیرِ تعلیم بنا دیا۔

پھر تعلیمی اسناد اس طرح بانٹی جانے لگیں جیسے سڑکوں پر گُپت روگ کے 'ڈاکٹر سے ملئے' کا پمپلیٹ بانٹا جاتا ہے۔اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کے سارے

عزیز واقارب ڈگریاں حاصل کر کے نوکری کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ یہ انگوٹھا چھاپ بھی خوش تھا کہ اسے بھی میٹرک سے بی اے تک کے سارے سرٹیفکیٹ بغیر امتحان میں بیٹھے ہی مل گئے۔

ایک بار جعلی ڈگریوں کے عوض بھاری رقم گھوس لیتے ہوئے وہ ایک خاتون صحافی کے ہاتھوں رنگے ہاتھ پکڑا گیا۔ اس گدھ کی نظر کا کیا کہنا۔؟ کیمرے پر پڑ ہی گئی۔ اس نے اسی وقت خاتون صحافی کو ننگا کر کے اس کے ہی کیمرے سے اس کی تصویر اُتار لی اور انٹرنیٹ پر ڈال کر اسی رات اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ لیکن معاملہ خودکشی کا ٹھہرا۔ اس لئے کوئی اس کا بال بھی بانکا نہیں کر سکا۔ مخالف پاٹیوں کے دباؤ میں آ کر چیف منسٹر نے بس اتنا کیا کہ اسے وزیرِ تعلیم سے برطرف کر کے وزیرِ صحت بنا دیا۔

وزیرِ صحت بنتے ہی نقلی دواؤں کی چاندی ہوگئی۔ تھوک کے بھاؤ میں جعلی لائسنس بننے لگے۔ نقلی ڈاکٹر تو اس نے پہلے ہی پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن نقلی مریض کہاں سے پیدا کرتے۔ مریض تو اصلی تھے ۔ اس لئے بے موقع و محل چھوٹی چھوٹی بیماریوں سے مرتے رہے۔ موت کا یہ سلسلہ سالہا سال جاری رہا۔ جب خود بیمار پڑتے تو موت کا خوف اسے بھی ستانے لگتا۔ اس وقت مجھے تاکید کرتے کہ اس ڈاکٹر کو بُلا کر مت لانا اور اس کمپنی کی دوائیاں مت خریدنا جسے سند اس نے دی ہے۔

ایم ایل اے سے منسٹر بننے تک جو بھی شعبہ اسے ملا، اس شعبے میں چار چاند لگانے کے لئے اس نے اس سے ملحق ایک اور شعبہ 'عشق' کا اپنے دفتر میں کھول رکھا تھا۔ ہر رات پلنگ کی چادر کی طرح اسے لڑکی بدلنے کی عادت تھی۔ گھر اور دفتر کی تو بات چھوڑئے، کار کی پچھلی سیٹ کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ یقین نہ آئے تو کار کے بلیک شیشے جو چشم دید گواہ ہیں ان سے پوچھ لیجئے۔

لیکن ایک روز غضب ہو گیا۔ جب اسٹیٹ لیول بیوٹی کانٹیسٹ میں خطاب جیتنے والی کو تاج پہنانے کے لئے انتظامیہ نے مسٹر کلین کو مدعو کیا۔ پروگرام کے بعد کھانے کا دور چلا ۔ پارٹی ختم ہوتے ہی مسٹر کلین، بیوٹی نمبر ون کا خطاب جیتنے والی دوشیزہ کے بیڈروم

میں مبارکباد دینے پہنچا۔عین اسی وقت لوڈ شیڈ نگ ہو گیا اور بجلی چلی گئی ۔اس لوڈ شیڈنگ کے نتیجے میں جب وہ ماں بن گئی تب بغیر پوچھے اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے مسٹر کلین نے مجھ سے کروادی۔رات گواہ ہے کہ اس نے کبھی اسے میرے کمرے میں رہنے نہیں دیا۔ ضرورت رہی تو استعمال کیا۔نہیں تو اپنے بیڈ کے برابر میرا بستر بچھوادیا۔اکیلے نہیں چھوڑا کہ جوٹھن ہو جائے گی۔

بیوٹی نمبر ایک نے ایک بیٹی کو جنم دیا اور میں باپ بن گیا۔بچّی بڑی ہونے لگی۔وہ مجھے اپنا باپ سمجھنے لگی۔اب میرے پاس ایک بنگلہ بھی تھا۔جو مسٹر کلین کا ہی دیا ہوا تھا۔یہ بنگلہ ٹھیک اس کے بنگلے کے سامنے تھا۔وہ اکثر آتے جاتے چائے کی چسکیاں لیا کرتا،مِس بیوٹی بھی بغیر کسی روک ٹوک کے مسٹر کلین کے پاس جایا کرتی ۔کبھی کبھی اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے جاتی ۔مسٹر کلین اکثر اس کا گال چھوتا۔پیار کرتا اپنی گود میں بٹھاتا۔پپّی لیتا اور ڈھیر ساری مٹھائیاں دیا کرتا۔باپ،بیٹی کے اس پیار کو دیکھ کر ماں عش عش کر اُٹھتی ۔لیکن بیٹی یہ نہیں جانتی تھی کہ مسٹر کلین اس کا باپ ہے۔وہ تو باپ اسے جانتی تھی جو مسٹر کلین کے ذاتی ہیلی کاپٹر کا پائلٹ تھا۔وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اس کا باپ اسے گھمانے نہیں لے جاتا۔لیکن مسٹر کلین انکل ہوتے ہوئے بھی فرصت کے اوقات میں اسے سیر وتفریح کے لئے لے جایا کرتے ہیں ۔ایک دن اس نے ماں سے کہا۔

''ممّی جانتی ہیں کلین انکل مجھے بہت پیار کرتے ہیں ۔میں کبھی سوچتی ہوں کہ اتنے بڑے آدمی کے احسانوں کا بدلہ کیسے چکاؤں ۔؟''

وہ مِس بیوٹی کی بیوٹی تھی ۔اس کی بیوٹی تب نکھر کر سامنے آئی جب جوانی کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی اس کی جسمانی ساخت میں ظاہری تبدیلیاں رونُما ہونے لگیں ۔مِس بیوٹی اپنی بیٹی کی خوبصورتی کو دیکھ کر اسے ہیروئن بنانے کے سپنے دیکھنے لگی۔لیکن مسٹر کلین اس کے حق میں نہیں تھا۔اسکول کی دہلیز پھلانگ کر وہ کالج کیا گئی کہ کالج کے لڑکے اس پر مر مٹے ۔مسٹر کلین نے غنڈے بھیجوا کر لڑکوں کی دھلائی کروادی ۔پھر اس کے بعد وہ اسے کالج چھوڑنے اور لانے خود جانے لگا۔اس وقت وہ ڈرائیور کا استعمال نہیں کرتا۔اس کی ضرورت

کی تمام خریداری وہ خود کرتا۔ بیوٹی پارلر بھی ساتھ لے جاتا۔ یہاں تک کہ دورے میں بھی اب وہ اسے اپنے ساتھ رکھنے لگا تھا۔

ایک بار بغیر سرکاری دورے کے ایک ہفتہ کے لئے جب وہ باہر گیا تو اسے بھی ساتھ لے لیا۔ اس دورے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ہیلی کاپٹر سے اُترنے کے بعد وہ سیدھے اپنی بیٹی کو لے کر ہوٹل چلا گیا اور پھر یہ پہلی بار ہوا کہ میرے ٹھہرنے کا انتظام دوسرے ہوٹل میں کیا گیا۔ مِس بیوٹی خوش تھی کہ مسٹر کلین نے بھلے ہی اس سے شادی نہ کی ہو، رکھیل کی طرح زندگی بھر رکھا ہو۔ لیکن بیٹی کے ساتھ ایک باپ کا فرض بخوبی نبھا رہا ہے۔ بیٹی بھی خوش تھی کہ مسٹر کلین اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ لیکن ایک دن مِس بیوٹی جب اچانک مسٹر کلین کے خواب گاہ میں پہنچی تو اپنی بیٹی کے سینے پر مسٹر کلین کے الجھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر آگ بگولہ ہوگئی۔

''کمینے! کیا کر رہے ہو تم.....؟''

''اب دیکھ ہی لی تو سُن لو میں اس سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔ زبان کھولی تو بہت بُرا ہوگا۔'' —— ——

''زبان —— میں تیرا خون پی جاؤں گی حرامی ——'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کی طرف دوڑی۔

تڑ... تڑ... تڑ....

تین گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ اُس وقت گولی کی آواز سُن کر میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ مسٹر کلین ریوالور کی نوک میری طرف کرتے ہوئے چیخا۔

''آج سے یہ میری بیوی ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ سمجھے۔؟''

اور میں سمجھ گیا۔ سمجھ تو میں پہلے بھی رہا تھا۔ لیکن موت کو دعوت کون دیتا۔؟ اپنی کاغذی بیوی کو جس کے سینے میں تین گولیاں لگی تھیں، مسٹر کلین کے حکم پر ایک بورے میں بھر کر کار کی ڈِکّی میں رکھا اور دور نہر میں پھینک آیا۔

بیٹی موت کی چشم دید گواہ تھی۔

ایک شوہر اپنی بیوی کے قاتل کو جانتا تھا۔

لیکن وہ بیٹی جو ماں کو کھو چکی تھی، مسٹر کلین کے ڈر سے اپنے باپ کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اور ایک شوہر جو کبھی اپنی بیوی کا شوہر تھا ہی نہیں، قاتل سے بدلہ کیا لیتا۔؟ لیکن ایک بیٹی کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ اس کی ماں کی موت کے بعد اس کا باپ مسٹر کلین کے ساتھ اب بھی پہلے کی طرح کیسے رہ رہا ہے۔؟

ایک دن مسٹر کلین جب تھک ہار کر اپنے خواب گاہ میں آرام فرما رہا تھا تب چپکے سے وہ میرے پاس آ گئی اور رونے لگی۔

''ڈیڈ مجھے اس نرک سے نکال لو۔ میں صرف نام کی اس کی بیوی ہوں۔ ہر رات نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کے کمرے میں ہوتی ہیں۔ میرا بس چلے تو اسے جان سے مار ڈالوں۔ لیکن مجھے اپنی نہیں۔ تمہاری فکر ہے ڈیڈ.... ڈیڈ اس سے ہوشیار رہنا۔ وہ حرامی کسی کا نہیں ہے۔''

لیکن میں اسے کیا بتاتا کہ میں ہی روز دلالوں سے مل کر لڑکیاں اس تک پہنچاتا ہوں۔ اور ایک باپ جب خود گراہک بن جائے تو صرف نام کا باپ اس نرک سے کیسے نکال سکتا ہے۔؟

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر غیر سرکاری دورے پر مسٹر کلین کو جانا ہوا۔ اس دورے میں اس کے ساتھ ایک ٹین ایجر لڑکی تھی جو اس کی بیٹی سے بھی بہت چھوٹی تھی۔

ہیلی کاپٹر سمندر کے کنارے ایک عالی شان ہوٹل کے سامنے بنے ہیلی پیڈ پر اُترا۔ اس رات مجھے سامنے والے ہوٹل میں نہیں ٹھہرنا پڑا۔ میں اس وقت اس کی اس ادا پر حیرت زدہ تھا کہ جب لڑکی اس کے ساتھ ہے تو پھر اسی کمرے میں مجھے ٹھہرانے کا جواز کیا ہے۔؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا اس نے میرے ہاتھ میں ویڈیو کیمرہ تھما دیا۔

دوسرے روز طے شدہ پروگرام کے تحت سمندری کناروں پر شوٹنگ ہونی تھی۔ پائلٹ کے بعد فوٹوگرافر کے طور پر میرا پروموشن ہوگا یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وقت پر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ دونوں ایک سے ایک پوز بناتے رہے اور میں زاویہ

تبدیل کرتا ہوا کیمرے کا لینس گھٹا تا بڑھا تا رہا کہ اچانک سمندری سائرن کی زوردار آواز فضا میں گونجنے لگی۔

میں نے دیکھا کہ سائرن کی آواز پر ساحلی مچھوارے سب کچھ چھوڑ کر زمینی سطح کی طرف بھاگنے لگے۔ سیر و تفریح کے لئے آئے لوگ بھی مچھواروں کے پیچھے پیچھے سمندر کے مخالف سمت دوڑنے لگے۔ اس دوران کچھ اونچے اونچے پیڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ پھر یکا یک لہروں کی ایک زوردار آواز ابھری اور تیز ہوتی چلی گئی۔ تب کہیں جا کر یہ پتہ چلا کہ سمندری لہریں پاگل ہو اُٹھی ہیں اور ہزاروں کلومیٹر کی رفتار سے ساحل سے ٹکرانے آ رہی ہیں۔ تب ہم سب بھی بھاگنے لگے تھے۔ ہوٹل کے چاروں طرف عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لہریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس سے پہلے طوفانی لہریں ہیلی پیڈ تک پہنچتیں ہم تینوں ہیلی کاپٹر پر سوار ہو گئے تھے۔

جب میں نے ہیلی کاپٹر اسٹارٹ کیا اس وقت لہریں چکّے کو چوم رہی تھیں اور اب بس ہیلی کاپٹر زمین چھوڑنے ہی والا تھا کہ مسٹر کلین ایک زوردار لہروں کو اپنی جانب آتے دیکھ کر پاگلوں کی طرح چلاّیا۔

''حرام خور.....جلدی اُڑان بھرو....جلدی کرو.....جلدی.....''

جب وہ پاگلوں کی طرح چلاّ رہا تھا، اس وقت اونچی سر پٹکتی ضدّی لہریں بالکل نزدیک آ گئی تھیں۔ وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ ٹین ایجر لڑکی کے ساتھ ننگا چپکا ہوا تھا۔

اس پوز میں نہ جانے کیوں وہ آج مجھے بہت اچّھا لگ رہا تھا۔ میں نے ہیلی کاپٹر کا اِسٹارٹنگ بٹن آف کیا اور ایک یادگار آخری تصویر اُتارنے کی لئے فوراً کیمرہ سنبھال لیا۔

☆

نیا گُھڑ سوار

نرناری کے ملن سے انسان کا وجود عمل میں آتا ہے۔اس لئے ہر انسان کے اندر ایک ناری اور ایک نر موجود ہوتا ہے ـــــ لیکن عام طور پر نر اپنی پہچان کے لئے اپنے اندر کی ناری کو مار دیتا ہے،اور ناری سماجی دباؤ میں اپنے اندر چھپے نر کو شرم وحیا سے ختم کر ڈالتی ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم لاکھ اپنے اندر کے نرناری کو مارنا چاہیں،لیکن وہ بے حیا پودے کی طرح دل کی سرزمین پر اُگتے ہی چلے جاتے ہیں۔

وہ دونوں بھی ایسے ہی نرناری تھے ـــــ

نر کو گُھڑ سواری کا شوق تھا۔کئی طرح کے کھیل جو اس کی گلیوں میں کھیلے جاتے تھے ،اس میں جب وہ جیت جاتا تھا تو ہارنے والے کی پشت پر سوار ہوکر گُھڑ سواری کیا کرتا تھا۔ گُھڑ سواری کرنے میں اسے بہت مزا آتا تھا۔لیکن ایک دن شام ڈھلے چُھپا چھپی کے کھیل میں وہ چور پر چور بنتا رہا۔اس نے ہار مان لی۔پھر اسے گھوڑا بننا پڑا تھا۔اور تب اسے ایسا لگا تھا جیسے گُھڑ سواری کرنے سے اچّھا ہے گھوڑا بننا۔اس کے بعد وہ اکثر دوستوں سے ہارنے لگا تھا۔لیکن جیسے جیسے بچپن اس کی زندگی سے دور ہوتا گیا، ویسے ویسے ہار کا یہ سلسلہ بھی کم

ہونے لگا۔ جوانی کی طرف بڑھتے ہی یہ کھیل تماشے اس کی زندگی سے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ لیکن کبھی کبھی گھڑ سواری کا یہ کھیل اُسے ایک دوسری ہی دنیا کی سیر کراتا تھا۔ وہ اس وقت اپنے اس بچپن میں لوٹ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اب وہ ایک باعزّت شہری تھا۔ سرکاری افسر تھا۔ جسے اپنے رُتبے کا بھی پاس تھا۔ اس لئے اس عمر میں گھوڑا بننا ایک مشکل امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ایک بہترین گھڑ سوار بننا چاہتا تھا۔ جس کے لئے اس نے ایک تندرست گھوڑی کا بھی انتخاب کر رکھا تھا۔

یہ ناری پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ لڑکے کی چاہت میں پانچ لڑکیاں ایک ایک کر کے چلی آئیں تو والدین نے چھوٹی کو لڑکے کے کپڑے پہنا کر، لڑکے کی طرح بال کٹوا کر، لڑکے کا نام رکھ کر بہت حد تک لڑکا بنا دیا تھا —— وہ بچپن سے ہی لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ بہت کم لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ اور جس کے ساتھ اس کی دوستی تھی اس کے گھر وہ گڈّا گڈّی کے کھیل میں بارات لے کر جایا کرتی تھی۔ اور اس شادی میں گڈّے کے باپ کا رول نبھاتے ہوئے گڑیا کو اپنی بہو بنا کر گھر لے آتی تھی۔ چھوٹے سے پلنگ کے مخملی چادر پر گڑیا کو لٹا کر اس کے اوپر گڈّے کو سلا دیتی تھی۔ دیر تک اس منظر کو دیکھتی رہتی تھی۔ پھر گڈّے کو اُٹھا کر چوم لیتی تھی۔ ایسا کرنے میں اسے بہت مزا آتا تھا۔

عمر زندگی کی سیڑھیاں چڑھتی رہی۔ ان دنوں اس کے جسم کے نشیب و فراز میں ایک طرح کی اُتھل پُتھل جاری تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکوں کے سنگ اس کے کھیل کود کا سلسلہ بھی پہلے کی طرح ہی چلتا رہا۔ لیکن ایک دن کھیل کھیل میں اس کے کپڑے خراب ہو گئے، تب اسے اس بات کا احساس ہوا کہ اس طرح سے لڑکوں کے کپڑے رنگین نہیں ہوتے۔ وہ لڑکی ہے اور اسے لڑکی کی طرح ہی رہنا چاہئے —— پھر وہ جینس، ٹی شرٹ کی جگہ شلوار قمیص پہننے لگی۔ سینے کو دوپٹّے سے ڈھکنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس نے لڑکیوں کی طرح سہج پاؤں رکھنا سیکھا۔ نظروں کا انداز بدلا۔ گفتگو میں نرمی کا اُنس شامل کیا۔

اور یہ سب کچھ جب تک اس کے اندر نہیں سمایا، حیادار لڑکیاں اس کے قریب آنے سے کتراتی رہیں۔لیکن جب ایک بار ظاہری نسوانیت کی خوشبو اس کے جسم کے مساموں سے نکل کر فضا کو سحر آگیں کرنے لگی تو وہ لڑکیاں بھی اس کے قریب آنے لگیں۔اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگیں۔لیکن جب بھی کوئی خوبصورت لڑکی اس کے ساتھ ہوتی تو اس کے اندر ایک طرح کی ہلچل برپا ہو جاتی۔مس کالج کو تو اس نے ایک دن سب کے سامنے زبردستی کِس بھی کر لیا تھا۔لیکن آہستہ آہستہ اس نے اس ہلچل پر قابو پا لیا..... -

اب وہ گڑیا کی ممّی بننے کے لئے تیار تھی۔لیکن جب بھی وہ گڑیا کی ممّی بننے کے بارے میں سوچتی، اس کے سامنے جینس، ٹی شرٹ پہنے اس کا ہمزاد گڈّے کو گھوڑے پر بٹھائے سامنے آجاتا اور اس وقت وہ عجیب کشمکش میں پھنس جاتی کہ اسے گڑیا کی ممّی بنے رہنا چاہئے یا گڈّے کی بارات لے کر گڑیا کے گھر جانا چاہئے۔

سوچ کا آئینہ اس کے سامنے ہوتا جس میں مستقبل کی تصویریں محوِ رقص ہوتیں۔ ان تصویروں میں ایک تصویر اس کی اپنی بھی تھی۔جو سوچ کے ریشمی پنڈال میں گڑیا بنی گھوڑے پر سوار اپنے گڈّے کے آنے کا انتظار کر رہی ہوتی۔

گھوڑا جہاں ہر رات اپنی گھوڑی کو دیکھتا، وہیں گڑیا اپنے گڈّے کو گھڑسواری کرتے دیکھ کر مچل اُٹھتی ..... دیکھتے دیکھتے ایک دن اس کے خواب حقیقت میں تبدیل ہو گئے اور خوابوں میں آنے والا گھڑسوار اس کا ہو گیا۔

گھڑسوار خوش تھا کہ اس نے جس گھوڑی کو پسند کیا تھا اُسے اُس کے گھر والوں نے اس کی زندگی کے اصطبل میں باندھ دیا تھا۔اور اب وہ زندگی کی سڑک پر گھڑسواری کا لطف اُٹھا سکتا تھا —— دوسری طرف وہ گڑیا جسے گھوڑے پر سوار اپنے خوابوں کے گڈّے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا وہ بھی اندر سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔کہ اب اس کے خوابوں کا شہزادہ، گھوڑے پر بٹھا کر ساری زندگی اسے خوابوں کی سیر کرائے گا۔ وہ کبھی آنکھیں نہیں کھولے گی۔بند آنکھوں سے ہی پوری دنیا کا سفر طے کرے گی۔

جب گھڑسوار گڑیا کو گھوڑے پر بٹھا کر زندگی کی سب سے خوبصورت سیر کے لئے

نکلا تو گڑیا نے اپنی آنکھیں مستقل بند رکھیں۔ کیوں کہ بند آنکھوں سے سب کچھ نظر آرہا تھا تو آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت کیا تھی۔؟ پھر آنکھیں کھلی رکھنے میں ڈر یہ تھا کہ کہیں پلکوں پر سجے حسین مناظر پھسل نہ جائیں۔اس لئے آنکھوں پر پلکوں کے جھالر کا گرا رہنا اس نے ضروری سمجھا۔

وہ جب بھی گھڑسواری کے لئے نکلتا، گڑیا اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ گھڑسوار کھلی آنکھوں سے زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لئے کہتا تو گڑیا مسکرا کر رہ جاتی۔ اپنی آنکھیں اور زور سے بند کر لیتی۔ لیکن جب ایک دن گھڑسوار نے قسم دلائی تو مجبوراً اسے اپنی آنکھیں کھولنی پڑیں۔ اور اس نے کھلی آنکھوں سے جب حقیقت کو قریب سے دیکھا تو چند حسین مناظر اس کی آنکھوں سے دور جا گرے۔اس نے اُٹھانے کی کوشش کی تو آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔

''تم رو کیوں رہی ہو.....؟'' گھڑسوار نے پوچھا۔

''روؤں نہیں تو اور کیا کروں ..... ؟ بھگوان اگر سامنے ہوتا تو میں پوچھتی کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ ایک ہی کام کے لئے ایک کو خوشیاں ملتی ہیں اور دوسرے کے حصّے میں صرف درد آتا ہے۔''

''نہیں، جسے تم درد سمجھتی ہو۔وہ وقتی ہے۔بھگوان نے اسی بہانے ناری کو زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔دنیا کی ساری خوبصورتی اسی 'درد' سے عبارت ہے۔''

لیکن گڑیا اس بات کو ماننے کے لئے تیّار نہیں تھی۔وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ اس درد میں مرد کی بھی برابر کی حصّہ داری ہونی چاہئے۔عورت ہی صرف بوجھ ڈھوئے ضروری نہیں ہے۔کبھی مرد کی ٹانگیں بھی لڑکھڑانی چاہئے۔تب وہ سارا فلسفہ بھول جائے گا کہ بوجھ لادنے سے زیادہ بوجھ ڈھونے والا مہان ہوتا ہے۔

گڑیا کے بدلے ہوئے رویّے کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہی ہے۔؟ کہیں اُلٹے سیدھے بہانے تلاش کر کے وہ اس

سے علاحدہ تو ہونا نہیں چاہتی ہے۔ لیکن وہ اس سے الگ کیوں ہونے لگی۔؟ کون سی فرمائشیں وہ اس کی پوری نہیں کرتا،؟ پھر بھی اس کے ساتھ وہ ایسا برتاؤ کر رہی ہے۔ جیسے وہ ناری نہ ہو۔ جیسے وہ.....؟

وہ کسی فیصلے تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

اُلجھن بھری ایسی کئی اور راتیں بیت گئیں .....

ایک رات وہ اُسے بہلا پھُسلا کر اپنے اصطبل تک لایا اور زبردستی کھونٹ سے باندھ دیا۔ گڑیا اس کی اس زیادتی سے اندر ہی اندر غصّے سے بھر جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں مارتی ہے۔ لیکن رسّی توڑ نا یا اصطبل سے بھاگ نکلنا اس کے لئے لگ بھگ ناممکن تھا۔ کیوں کہ اس کی پیٹھ پر زِین کَس دیا گیا تھا۔ اس وقت گھُڑسوار نے منہ میں لگام ڈال کر اسے پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچ رکھا تھا۔ ہلنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ اس زیادتی کو وہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پائی ۔رونے لگی۔

''جب تک میں ناری ہوں، تم طاقت دکھا سکتے ہو۔ لیکن جس دن میں ناری کے خول سے باہر نکلی، اس دن میں تم سے بدلہ ضرور لوں گی۔''

نر بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو جاؤ۔ کچھ خرید لاؤ۔ اور باندھ کر جتنا چاہو اُچھلو کو دو.....تھک ہار کر تمہیں ہی زمین پر آنا ہوگا۔''

گڑیا کے گالوں کو زور سے کھینچتے ہوئے وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر غرور کی گھڑسواری کرتے کرتے کہتا ہے۔

''زندگی میں، میں نے کسی سے ہار نہیں مانی ہے۔ تم کیا ہراؤ گی مجھے....؟ ''

لیکن اتنا کہتے ہی بچپن کا وہ کھیل، جسے وہ بچپن کی گلیوں میں شام ڈھلے کھیلا کرتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ وہ کھیل کھیل میں ہار جاتا تھا اور ہارنے کے بعد اسے گھوڑا بننا پڑتا تھا۔ گھڑسواری کے اس کھیل میں اُسے اتنا مزہ آنے لگا کہ اس کے بعد وہ چھُپا چھُپی کا کھیل، صرف ہارنے کے لئے ہی کھیلا کرتا۔ کیوں کہ اس ہار میں اُسے جیت

سے زیادہ سرور ملتا تھا۔

ایک ایسی ہی رات تھی .....

اُس رات بھی وہ اُسے اس کی مرضی کے خلاف اُٹھا کر اپنے اصطبل میں لے آیا تھا۔اوراس رات بھی اس نے اُس پراُسی طرح سے زِین کس دیا تھا۔اوراُس رات بھی وہ مضبوطی سے لگام کو اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھا تھا —— دردا‌ُس کے انگ انگ میں سمارہا تھا۔وہ چھٹپٹارہی تھی۔اس سے زندگی کا یہ درد سہانہیں جارہا تھا۔درد بتدریج بڑھتا ہی جارہا تھا۔اور جیسے جیسے درد بڑھ رہا تھا، ویسے ویسے اس کے جسم میں سختی آتی جارہی تھی۔اور جیسے جیسے سختی بڑھ رہی تھی اس کے اندر کسی چیز کے سرسرانے کی رفتار تیز سے تیز ہوتی جارہی تھی۔ اوراس سرسراہٹ نے اس کے درد میں اور اضافہ کردیا تھا۔وہ دوہرے درد سے اور بھی بے چین ہو اُٹھی تھی —— اور جسم کی سختی تھی کہ مزید بڑھتی ہی جارہی تھی۔گھڑسوار کے راستے میں جب یہ سختی حائل ہوئی تو گوشت پوشت کی جیتی جاگتی گھوڑی کاٹھ میں بدل گئی ۔ اس وقت گھڑسوار کو اپنا سفر دشوار گذار لگنے لگا۔اس کے بعد اس نے غصّے سے لکڑی کی اس گھوڑی کی لگام کو زور زور سے کھنچنا شروع کیا۔منزل تک گھوڑی کو کھینچ کر لے جانے کی انتھک کوشش کی۔لیکن ناکام رہا۔ جھنجھلاہٹ میں اس نے گھوڑی کے بالوں کو نوچنا شروع کردیا۔

''سالی —— ! تم نے اپنا جسم کیسا بنا رکھا ہے کہ قبضے میں نہیں آتا.....؟ ''

وہ کچھ نہیں کہتی ہے....

دھیرے دھیرے کسے ہوئے زِین پر اس کے پاؤں کا دباؤ کم ہوجاتا ہے۔لگام ہاتھوں میں ڈھیلی پڑجاتی ہے۔مجبوراً اسے گھوڑی پر سے اُترنا پڑتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کاٹھ کی گھوڑی گوشت پوشت میں بدلنے لگتی ہے.....

گھڑسوار دوبارہ زِین پر پاؤں رکھ کر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

..... وہ روکتی ہے۔

''جانور اور پودے بھی اپنا دفاع کرتے ہیں۔پھر میں تو انسان ہوں —— تم نر

ہو۔ طاقت ور ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم جب چاہو میرے اوپر زِین کَس دو۔''
''بگڑیل گھوڑی کو سدھانے کے لئے لگام لگانی پڑتی ہے۔''
''جس دن گھوڑی بے لگام ہوگئی اس دن......''
''وہ مجھے پٹک دے گی۔''
''اور جب ہڈّ یاں ٹوٹیں گی تب سمجھ میں آئے گا کہ ناری کا درد کیا ہوتا ہے۔''
اس بات پر گھڑسوار اندر ہی اندر مسکرا اُٹھتا ہے۔ اور پھر اپنی لاچاری ظاہر کرتے ہوئے اُسے منانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس پر دوبارہ زین کس سکے..... منزل تک پہنچ سکے۔
''کیا کروں یہ ' درد ' بانٹا بھی تو نہیں جاسکتا....؟''
''بانٹا جاسکتا ہے۔''
''وہ کیسے.....؟''
''جیسے تمہارے اندر 'میں' اور میرے اندر 'تم' موجود ہو۔''
''نہیں! نر کے اندر صرف ' نر ' اور ناری کے اندر صرف ' ناری ' ہوتی ہے۔''
حالانکہ گھڑسوار نے اپنی طرف سے اس بات کو منوانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن گڑیا کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کے لئے تیّار نہیں ہوئی۔ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اس بحث کے دوران وہ تکیہ کے نیچے سے کچھ نکالتی ہے۔ اُس وقت گھڑسوار کو اس کے جسم میں پہلے سے بھی زیادہ سختی محسوس ہوئی۔ اُس نے اندھیرے میں اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ کمر میں کچھ باندھ رہی ہے۔ پھر اُس کا سب سے اہم سِرا اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔
یکا یک اُس کے اندر سنسنی سی پھیل گئی اور جسم خود بخود ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔
گھڑسواری کرتے کرتے وہ 'گھوڑا' بن گیا۔

☆

برف پگھلے گی

''سر اِن پہاڑی چوٹیوں پر صدیوں کی جمی ہوئی برف جسے آپ دیکھ رہے ہیں نا۔
وہ ایک دن میرے جسم کی گرمی سے پگھل جائے گی۔''

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرا تبادلہ دوسری جگہ ہو گیا تھا۔ سارا اِسٹاف مجھے الوداع کہنے کے لئے کا زا بس اِسٹینڈ تک آیا تھا۔ تب میں آخری بار پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کو کیمرے میں قید کر رہا تھا کہ لو بزانگ گیا چو نے بڑے ہی راز دارانہ انداز میں چوٹیوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے مجھ سے یہ کہا تھا۔

پرنسپل کے بعد ڈپٹی ڈائریکٹر بن کر انسپیکشن کے لئے جب قریب آٹھ سال کے بعد ان وادیوں میں دوبارہ پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پہاڑی چوٹیوں پر صدیوں کی جمی ہوئی برف پگھل چکی ہے۔ تب مجھے لو بزانگ گیا چو بہت یاد آیا۔ وہ اسپیتی کا ہی رہنے والا تھا۔

لاہول اِسپیتی رہائشی اعتبار سے ہندوستان کی سب سے اونچی جگہ ہے۔ سمندری سطح سے یہ حصّہ تقریباً چودہ ہزار سے سولہ ہزار فٹ کی اونچائی پر واقع ہے۔ دنیا کا سب سے اونچا پٹرول پمپ اور ڈاک خانہ یہیں ہے۔ یہاں کا درجہءحرارت موسمِ سرما میں مائنس پچیس سے چالیس تک پہنچ جاتا ہے۔ سالوں بھر برف باری ہوتی ہے اور پہاڑوں کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اسپیتی میں برف باری اپنے شباب پر تھی۔ اس دن اچانک موسم خراب ہو گیا تھا اور آسمان سے برف روئی کے گالوں کی طرح چاروں اور بکھر رہی تھی۔ آدھے گھنٹے میں دو تین انچ موٹی برف کی اجلی چادر بچھ گئی۔ موسم کے مزاج کو دیکھتے ہوئے آج بچّوں کی پہلے ہی چھُٹّی کر دی گئی تھی۔ تمام اساتذہ لنچ کے لئے میس جا چکے تھے۔ مجھے ایک لیٹر ڈکٹیٹ کروانا ضروری تھا۔ اس لئے لو بزانگ گیاچو کو میں نے روک لیا تھا۔ جب کام ختم ہوا تو چاروں طرف برف کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی لو بزانگ گیاچو نے جیکٹ پر جمی برف کو جھاڑا اور پھر حسبِ معمول جیسے ہی میس کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ـــــ ''گیاچو جی! اس موسم میں سبزی سے کام نہیں چلے گا۔ چلو گھر میں ہی آج انڈہ کڑی بناتے ہیں۔'' وہ انڈے کا شوقین تو تھا ہی، فرماں بردار بھی تھا۔ مسکراتے ہوئے پلٹا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

لو بزانگ گیاچو سے میری ملاقات بارہ سال قبل ہوئی تھی۔ وہ چار سال تک میرا کلیگ تھا۔ میرے اسپیتی پہنچنے سے پہلے وہ لائبریرین کے طور پر کام کر رہا تھا۔ پرمانینٹ لائبریرین کے آجانے پر میں نے اسکول کے مفاد کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اسے آفس میں ایل ڈی سی کے طور پر ایڈجسٹ کر دیا تھا۔

لو بزانگ گیاچو میں پتہ نہیں ایسی کون سی بات تھی جو اسے دوسرے تمام اسپیتی والوں سے الگ کرتی تھی۔ گول سڈول جسم، چوڑی پیشانی، چھوٹی ناک، اندر کی طرف گھسی ہوئی آنکھیں، سیاہ سلجھے بال، مونچھیں اور داڑھی ایسی جیسے جلد بازی میں شیو کے بعد بال کہیں کہیں رہ گئے ہوں ـــــ اس کی طرح کا مہذّب شخص مجھے اس دور دراز علاقے میں کوئی دوسرا نظر نہیں آیا۔ دوسروں کا دکھ درد اس کا اپنا دکھ درد تھا۔ وہ ہر طرح سے میری مدد کیا کرتا تھا۔ اسکول کے وہ سارے کام جو اس کے سپرد کئے جاتے، انہیں بحسن وخوبی وہ اس طرح انجام دیتا کہ میں عش عش کر اٹھتا۔ وہ پالٹیکل سائنس میں ایم اے تھا اور ایم لِب بھی کر چکا تھا۔ نوکری کے لئے کہیں نہ کہیں ہر مہینے فارم بھرتا۔ انٹرویو کے لئے جاتا۔ لیکن

سیاست پر گہری نظر ہونے کے باوجود وہ سِڈ ول ٹرائب رعایت کا فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ کیوں کہ وہ نوکری کے اکھاڑے میں سیاسی پہلوانوں کے داؤں پیچ سے ابھی اتنا واقف نہیں ہوا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے بخاری جلائی۔ پھر ہم دونوں نے انڈہ کڑی اور روٹی بنائی۔ خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر بعد میں کافی بنانے کے لئے اٹھا تو لو بزانگ گیاچو نے کافی کی شیشی مجھ سے چھین لی ـــــ ''سر آپ بیٹھئے۔ میرے ہاتھ کی کافی آج پی کر دیکھئے۔'' واقعی اس نے کافی بہت اچّھی بنائی تھی۔ میں کافی پی رہا تھا اور کھڑکیوں کے شیشے سے برف کے چھوٹے چھوٹے گالوں کو ایک سیدھ میں کھڑے پتّیوں سے بے لباس، پاپولر کی اونچی اونچی شاخوں پر جھولتے دیکھ رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا کہ یکا یک بڑھتی ہوئی سردی میں جسم کو کچھ اور حرارت بخشنے کے لئے ترکیب کی بخاری میں، میں نے شرارت کی ایک لکڑی رکھی اور سوچ کی آگ تاپتے ہوئے لو بزانگ گیاچو کو چھیڑا۔

''تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔؟''

''سر کہیں پرمانینٹ نوکری ہو جائے تو سوچوں گا۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ پرمانینٹ نوکری کے انتظار میں وقت کے پلگ میں کاربن جم جائے اور ہمیشہ کے لئے زندگی کا اِنجن بند ہو جائے۔ پھر کیا کرو گے۔؟ تمہاری عمر میں تو بہت سارے لوگوں کے بچّے ہائی اسکول پاس کر جاتے ہیں۔ عمر کے آخری حصّے میں ایک ساتھی کی ضرورت اور بھی شدّت سے محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے اب بھی وقت ہے۔ کوئی اچّھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لو۔''

''لیکن مجھ سے شادی کون کرے گا۔؟'' اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ پھر کچھ رک کر آگے کہا۔ ''سر آپ نہیں جانتے کہ یہاں شادیاں کتنی طرح سے ہوتی ہیں۔ زیادہ تر شادیاں ویسی ہوتی ہیں، جس میں لڑکا لڑکی کو بھگا کر یا زبردستی اٹھا کر لے جاتا ہے۔ جس میں اکثر لڑکی اور اس کے گھر والوں کی مرضی بھی شامل نہیں رہتی۔ جہاں ہم بستری ہوئی سمجھئے 'چھوٹی شادی' ہو گئی۔ باضابطہ وہ سماج کے سامنے سسرال میں رہتی ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹی شادی میں بچّے بھی پیدا کر لیتی ہے۔ اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ 'بڑی شادی' اس دن

ہوتی ہے جس دن لڑکے والے سارے سماج کے سامنے اپنے لڑکے کے کارنامے کو فخریہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور پارٹی دیتے ہیں ـــــ لاما شادی کی رسمیں نبھاتے ہیں۔''

نہیں ایسی بات نہیں ہے سر ـــــ ! دوسروں کی طرح بھگانے کی ہمّت مجھ میں بھی ہے۔لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔رہی بات لڑکی کے پسند آنے کی تو پسند تو کئی آئیں۔لیکن اس کی پسند پر میں ہی کھرا نہیں اُترا تو اسے چھمّو (بیوی) کیسے بناتا۔؟ میں نے پڑھائی دلّی اور چنڈی گڑھ میں کی ہے۔اس لئے جانتا ہوں کہ میدانی علاقوں میں تلک اور جہیز کے بغیر لڑکی کی شادی نہیں ہوتی۔لیکن اس کے برعکس یہاں لڑکے کی شادی تبھی ہو سکتی ہے جب اس کے پاس لڑکی کو جہیز میں دینے کے لئے گھر،کھیت اور بینک بیلنس ہو۔ جس کے پاس یہ سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔اُسے زندگی بھر کنوارا رہنا پڑتا ہے۔میں بھی کنوارا مروں گا۔''

''سر میں نے تو پہلے ہی کہا ہے۔یہاں کا قانون دنیا کے دوسرے قبائلی حصّوں سے بہت مختلف ہے۔یہاں صدیوں سے جائداد کی تقسیم نہیں ہوئی ہے۔نسل درنسل ساری جائداد کا وارث بڑا لڑکا ہی ہوتا آیا ہے۔اور یہی چھوٹے بھائیوں کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔''

''آپ نے بالکل سہی سمجھا۔والدین کی جائداد میں سے چھوٹے بھائیوں کو کچھ نہیں ملتا۔میرے والد کو ہی دیکھئے۔اُن کے پاس کیا نہیں تھا۔؟ چار منزلہ گھر،ہوٹل،کھیتی کے لائق اچھی خاصی زمین اور بینک بیلنس۔پی ڈبلو ڈی سے بحیثیت اکاؤنٹ افسر جب وہ ریٹائرڈ ہوئے تو ایک کثیر رقم ان کے ہاتھ آئی۔ہم تین بھائی تھے۔اگر وہ چاہتے تو تینوں میں برابر برابر جائداد کی تقسیم کر کے سبھی کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر سکتے تھے۔لیکن سماجی دباؤ اور بڑے بھائی کے باغیانہ رویّے کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے۔اس میں قصور میرے والد کا نہیں بلکہ یہاں کے قانون کا تھا ـــــ دوسرے نمبر والا بھائی لاما بن گیا۔''

''دوسری بار اگر یہاں کی دھرتی پر آنے کا موقع ملا تو میں سب سے پہلے ماں کی کوکھ پر قبضہ جماؤں گا۔یا پھر لاما بن جاؤں گا۔یہاں کے قانون کے مطابق ہر خاندان کے

ایک لڑکے کو 'لاما' اور ایک لڑکی کو 'چومو' بننا پڑتا ہے۔ ورنہ سوشل بائیکاٹ۔ اگر کسی خاص وجہ سے کسی کو رعایت مل بھی جائے تو اسے پوری زندگی کسی لاما یا چومو کا خرچ اُٹھانا پڑتا ہے۔ یا پھر جُرمانے کے طور پر ہزاروں روپئے گومپا میں جمع کروانے پڑتے ہیں۔ 'لاما' اور 'چومو' کو اپنے سر کے بال منڈوا کر کتھے رنگ کا چولا پہن کر ساری زندگی گومپاؤں میں گزارنی پڑتی ہے۔ مہاتما بدھ کی زندگی کا ادھّین کرنا پڑتا ہے۔ دلائی لاما جی کے آدرشوں پر چلنا پڑتا ہے۔ وہی مذہبی کاموں میں، شادی بیاہ میں، پیدائش اور موت کے سمئے پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ اس کے رہنے سہنے اور کھانے پینے سے لے کر ضرورت کی ساری ذمہ داری گومپا کے ہیڈ لاما پر ہوتی ہے۔ یہاں باہر سے بھی پیسے آتے ہیں اور لوگ چندہ بھی دیتے ہیں۔ اس لئے وہاں اسے کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی۔ صرف شادی کا سکھ اس کے نصیب میں نہیں ہوتا ——

آپ یقین مانئے سر کہ یہاں بے شمار نوجوان ایسے ہیں جو زندگی کے اس حسین سپنے کو دیکھ تو سکتے ہیں لیکن اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ کیوں کہ اس کے لئے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نوکری کی ضرورت ہوتی ہے.....لیکن ہم جیسوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چھوٹے ہونے کا گناہ زندگی بھر بھگتنا پڑتا ہے۔ سو ہم بھگت رہے ہیں۔''

''نہیں آپ کا سوچنا بالکل غلط ہے۔ ایک نے آواز اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت ہم سب چھوٹے تھے۔ گومپا کے ہیڈ نے اس کے خلاف فتوہ صادر کر دیا۔ لوگوں نے پاگل کہہ کر پتّھر مار مار کر اسے ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سلا دیا کہ اگر زندہ رہا تو دوسروں کو ورغلائے گا۔ زمین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھیت کا نام و نشان ختم کر دے گا۔ پھر مٹر، آلو اور جو کی کھیتی کہاں ہوگی ..... ہندوستان کا سب سے بہترین مٹر یہیں پیدا ہوتا ہے۔ ٹھنڈ سے لڑنے کے لئے گھر گھر شراب کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ شراب 'جو' سے بنائی جاتی ہے۔ اس لئے لوگ ڈرتے ہیں کہ کہیں کھیت ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اسے بچانے کے لئے غیر منقسم جائداد قانون کو دیوتاؤں کا قانون بتاتے ہیں۔''

''آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے سر! پرانے زمانے میں تو کھیت کو بچانے کے لئے یہاں 'کامن شادی' کا بھی رواج تھا۔ جس میں ایک لڑکی کے ساتھ ہوتی تو تھی صرف بڑے

بھائی کی شادی، لیکن اس کی غیر موجودگی میں تمام چھوٹے فیض یاب ہوا کرتے تھے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ عورت اس کھیت کی طرح ہے جسے کوئی بھی ضرورت پڑنے پر جوت سکتا ہے۔ کھیت کا کام صرف فصل اُ گانا ہے —— لیکن جیسے جیسے لوگ تعلیم سے آشنا ہوئے اور اپنی اولادوں کو پڑھنے کے لئے باہر بھیجنے لگے، ویسے ویسے دروپدی سسٹم ختم ہوتا چلا گیا۔ اب بھی یہ پوری طرح سے ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن جہاں ختم ہو گیا ہے، وہاں چھوٹے بھائیوں کا جینا محال ہو گیا۔ کیوں کہ زیادہ تر بڑے بھائیوں نے اپنی عزّت اپنی تحویل میں ڈال لی۔ اور چھوٹے بھائیوں کو گھر سے بے دخل کر دیا کہ ساتھ رہیں گے تو اس کی غیر موجودگی میں منہ مارنے سے باز نہیں آئیں گے۔''

''آپ نے بالکل درست فرمایا۔ جب چھوٹا ہوش سنبھالتا ہے تب اُسے ایسا لگتا ہے کہ وہ زندگی بھر چھوٹا ہی رہے گا۔ کبھی بڑا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ وہ شروع سے بڑے اور چھوٹے خاندان کو اپنے آس پاس دیکھتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ اس بات کو خود سے تسلیم کر لیتا ہے کہ سماج میں بڑے خاندان کا ہی رعب ودبدبہ چلتا ہے ۔ پردھان ان ہی گھروں سے بنتے ہیں۔ ضلع پریشد، ایم ایل اے اور ایم پی کے لئے کوئی دوسرا اپنی دعویداری نہیں پیش کر سکتا ——لیکن جو چھوٹا ہے۔ وہ اور بھی چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف سرکار کی طرف سے شادی کے بعد گھر بنانے کے لئے 'نوتوڑ زمین' ملتی ہے۔ کم آکسیجن والی اس جگہ میں کچھ ہی لوگ ایسے ہیں جو دن رات محنت ومشقت کے بعد مٹّی کی دیواروں پر ٹین نما چھت ڈال کر برف باری اور سرد ہواؤں سے خود کو محفوظ رکھ پاتے ہیں۔''

''نہیں سر میں نے گھر نہیں بنایا۔ اور پھر بناؤں بھی تو کیسے۔؟ گھر کے لئے گھر والی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور گھر والی کے لئے شادی کی —— شادی کے لئے یہاں مائیں بیٹیوں کو ٹرینڈ کرتی ہیں کہ شادی جب بھاگ کر ہی کرنی ہے تو کوئی ڈھنگ کا لڑکا چننا۔ جس کے پاس سب کچھ ہو۔ چھوٹے کو یہاں لڑکیاں گھاس بھی نہیں ڈالتیں۔ اور جو لڑکیاں لڑکا چننے میں پیچھے رہ جاتی ہیں، یا اسے بھگا کر کوئی نہیں لے جاتا ہے تو وہ بدقسمت سمجھی جاتی ہیں۔ مائیں بھی کوستی ہیں کہ کیسی لڑکی اس نے جنی ہے کہ ایک لڑکے کو رِجھا نہیں سکتی —— شرمیلی

صفت لڑکیوں کو جبراً سجا سنوار کر آرا (شراب) پلا کر چھنکا، برتھ ڈے اور شادی بیاہ جیسے موقعوں پر لڑکوں کے ساتھ ڈانس کرنے کے لئے مجبور کرتی ہیں تاکہ وہ اپنی شہوانیت کی بو سے من چاہے لڑکے کو مسحور کر سکے۔ جس دن لڑکی کو کوئی بھگا کر لے جاتا ہے، اس دن مائیں خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ گھر گھر جا کر عزّت کی مٹھائیاں بانٹتی ہیں اور چین کی نیند سوتی ہیں۔''

''یہ بات آپ نہیں بھی پوچھتے تب بھی میں اس راز کو آپ سے نہیں چھپاتا آج سے آٹھ نو سال قبل کی بات ہے۔ میں چنڈی گڑھ میں ایم لِب کر رہا تھا۔ وہیں مجھے دھرم شالہ کی ایک لڑکی پسند آ گئی تھی۔ اسے میں نے اپنے بارے میں سچ سچ بتا دیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ میرے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے تیّار تھی۔ لیکن شادی سے پہلے وہ ایک بار اسپیتی کی حسین وادیوں کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ ایک ہفتہ تک وہ میرے ساتھ پانچوں اہم گومپاؤں کے درشن کرتی رہی۔ تاریخی مقامات دیکھتی رہی۔ 'تابو' کا ہزاروں سال پرانا گومپا۔ 'کی' اور 'ڈنکھر' کے خوبصورت مذہبی مقامات۔ 'گھیو' کی ممی۔ حکّم میں گرم پانی کا چشمہ۔ چندرتال جھیل۔ میرے منع کرنے پر بھی وہ اس کے ٹھنڈے پانی میں نہانے اُتر گئی۔ اِس جنون میں کہ وہاں پریاں نہایا کرتی تھیں، وہ بھی ایک ماڈرن پری ہے۔''

''اسپیتی واقعی اسے بہت اچّھا لگ رہا تھا۔ وہ خوش تھی۔ میں بھی اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ تنزین ڈولکر جیسی خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی میری زندگی کا حصّہ بننے جا رہی ہے ـــــ دوسرے دن گومپا میں شادی کی رسمیں نبھائی جانی تھیں۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ دوسری صبح خوشی خوشی جب میں اسے اُٹھانے کے لئے گیا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اتنی ٹھنڈ میں بھی اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ وہ بستر پر نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ فارغ ہونے کے لئے اکیلی ندی کی طرف نکل گئی ہوگی۔ بہت دیر تک اس کا انتظار کرنے کے بعد بھی اس کا کہیں کوئی پتہ نہیں چلا ـــــ شام ڈھلے معلوم ہوا کہ وہ پڑوس کے میرے ہی ایک دوست کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ وہ بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس دن مجھے زندگی میں پہلی بار لگا کہ چھوٹا ہونا کتنا بڑا عذاب ہے۔ اور اس دن یہ بھی لگا

کہ چل کر اپنے بڑے بھائی کو گولی مار دوں اور ساری جائداد کا مالک بن جاؤں۔''

یہ کہتے کہتے برف باری کے اس موسم میں وہ ہانپنے لگا تھا۔ پیشانی پر قطرے جھلملانے لگے تھے۔ جسم ڈھیلا پڑنے لگا تھا۔ وہ بستر پر جب اطمینان سے لیٹ گیا تب میں نے اپنی زندگی کا سارا رس نچوڑ کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جس کی بوند بوند میں حوصلے کی نئی کہانی پوشیدہ تھی۔

''گیا چو جی! میری ایک بات یاد رکھو۔ حق نہ مانگا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی دیتا ہے۔ حق ہمیشہ چھینا جاتا ہے۔ جب تک تم اس لائق نہیں ہو گے تب تک خلاء میں اسی طرح لٹکے رہو گے۔''

شاید خلاء میں زندگی بھر لٹکے رہنا اسے منظور نہیں تھا۔ اس لئے میری باتوں کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت سوچ کے مضبوط دھاگے سے تنظیم کے خواب بننے لگا۔ میرے وہاں سے لوٹتے ہی اس نے پارٹ ٹائم نوکری چھوڑ دی۔ دن رات گھوم گھوم کر غیر منقسم بنٹوارہ سسٹم کے خلاف لوگوں کو ایک جُٹ کرنا شروع کیا۔

شروع شروع میں لوبزانگ گیا چو کو اپنی بات رکھنے میں بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کے اندر ایک ڈر تھا کہ کہیں 'بڑے خاندان' والوں کو معلوم ہو گیا تو وہ مرنے مارنے پر اُتر آئیں گے۔ مذہبی رہنما بھی اس سسٹم کی حمایت میں کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ سوشل بائیکاٹ کر دیں گے۔ جرمانہ جو لگے گا سو الگ.....ایسے سوالوں کا لوبزانگ گیا چو نے ہمیشہ ہی بڑی مہارت کے ساتھ جواب دیا اور لوگوں کو مطمئین کرنے کی کوشش کی کہ ''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ صدیوں سے یہ لوگ ہمارا سوشل بائیکاٹ ہی تو کرتے آئے ہیں۔ اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک ہم خاموشی کی بانسری بجاتے رہیں گے۔ دماغ سے کام لو اور اپنے حق کے لئے آگے آؤ۔''

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ گومپاؤں میں جو گرنتھ رکھے ہوئے ہیں، اس میں ہی کہیں لکھا ہوا ہے کہ بڑا لڑکا دیوتا سمان ہوتا ہے۔ اس لئے وہی وراثت کا اصل حق دار ہے۔''
رنچن بودھ نے سچّائی جاننے کی کوشش کی۔

''تم نے خود پڑھا ہے۔؟''لو بزانگ گیاچو نے پوچھا۔

'نہیں مجھے بھوٹی بھاشا نہیں آتی۔لیکن جب ہمارے آباواجداد ایسا کہتے آئے ہیں تو یہ صحیح ہی ہوگا نا۔؟'' رنچن بودھ نے لفظ 'صحیح' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے بھوٹی بھاشا پڑھی ہے اور اسپیتی کے پانچوں اہم گومپاؤں میں رہ کر ان گرنتھوں کا ادھّین بھی کیا ہے۔لیکن مجھے کہیں ایسی بات نظر نہیں آئی.....یہ غلط پرمپرا ہے۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف اگر آواز اُٹھائیں گے تو ہمارے دیوتا ناراض ہو جائیں گے۔''

''لیکن ایسا ہوا ہے۔''سونم انگدوئی نے کہا۔ ''بہت پہلے جب ایک نوجوان دلّی سے پڑھ کر لوٹا تو اس کے ہاتھ میں اکثر مارکس کی کتابیں ہوا کرتی تھیں۔اس نے بٹوارے کی بات اُٹھائی۔لیکن دیوتا ہمارا ناراض ہوگیا۔اور اس رات وہ سویا کا سویا رہ گیا۔''

''دیکھو یہ سب کہانیاں ہیں۔من گھڑنت کہانیاں۔ہمیں ڈرانے اور بے وقوف بنانے کے لئے.....کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ بڑے خاندان والوں کے دباؤ میں آکر گھر والوں نے اس کے کھانے میں زہر دے دیا ہو اور وہ بےچارہ صبح جاگنے سے رہ گیا ہو۔''

''بات جو بھی ہو۔لیکن ہم اپنے دیوتاؤں کو ناراض نہیں کرسکتے۔'' چھیرنگ انگروپ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی جیسے کسی حادثے کے ہونے کا اندیشہ ہو۔آہستہ آہستہ اس آواز میں کچھ اور بھی آوازیں شامل ہوگئیں۔

''تو ٹھیک ہے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے لاماؤں کو بلا کر ٹانا مانا (پوجا پاٹھ) کرالیں گے۔''لو بزانگ گیاچو نے لوگوں کی نبض ٹٹولتے ہوئے مرضِ لادوا کے لئے نسخہ تیّار کرلیا۔

پھر گھر گھر 'اوم مانے پدمے ہنگ' جیسے منتروں کا جاپ شروع ہوگیا ——
پتّھروں پر اشلوک کھدوا کر سڑکوں کے کنارے لگوائے گئے۔
استوپ بنا کر گومپاؤں میں رکھا گیا۔
گیتیور کو زیادہ سے زیادہ گھمایا گیا۔

اور یہ سب اس لئے کیا گیا تا کہ زیادہ سے زیادہ پُیبہ کما سکیں اور کامیابی کے راستے پر جلد سے جلد گامزن ہو سکیں۔

اور پھر ایک دن لوبز انگ گیا چو کی محنت رنگ لائی۔ اور سوچ کے دھاگوں سے بنی تنظیم حقیقت کی سرزمین پر تعمیر ہوگئی۔ لوبز انگ گیا چو کو بغیر کسی ردّ و کد کے صدر چن لیا گیا۔ تنظیم کی پہلی باضابطہ میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ 'کال چکر' میں جب دلائی لاما جی پروچن کے لئے اسپیتی آئیں گے تب ان کے سامنے اس مسئلے کو رکھیں گے۔ کوئی نہ کوئی حل وہ ایسا ضرور نکال دیں گے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ گومپا کے ہیڈ لاما ہمیں ان سے ملنے کی اجازت دیں گے ......؟'' سیرپ کیسنگ نے سوال کیا۔

''اگر بڑے خاندان والوں کو اس کی بھنک لگ گئی تو پھر 'کال چکر' جیسے پوتر مہوتسو میں گڑ بڑ ہو جائے گی اور سارا الزام چھوٹے خاندان کے سر تھوپ دیا جائے گا۔ پھر کبھی ہم دلائی لاما جی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے ـــــ'' پدما چھوئنگ اندر سے خوف زدہ تھا۔

ان سوالوں کا جواب دینے اور ان کے اندر بیٹھے ہوئے ڈر کو باہر نکالنے کے لئے ایک دن لوبز انگ گیا چو سامنے کی پہاڑیوں پر مجبوراً آباد ہوئے' چھوٹے خاندان ، والوں کے ساتھ میٹنگ کرنے پہنچا۔ وہاں سے جب اس نے نیچے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا اور سوچنے لگا کہ دن رات پہاڑوں کو کاٹ کر سیڑھی نُما کھیت ہم بناتے ہیں اور کھیت ان کے شاداب نظر آتے ہیں۔ کیوں نہ چٹّان کاٹ کر جھرنے کا رُخ موڑ دیا جائے تا کہ ہمارے کھیت بھی ہریالی اگلیں۔

لیکن جب ارادے چٹّانوں سے ٹکرانے کے لئے تیّار ہوں تو دشواریاں خود بخود آسانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں ـــــ جھرنے کا رُخ موڑ دیا گیا۔ اس پر بہت ہنگامہ ہوا۔ مار پیٹ بھی ہوئی۔ معاملہ کورٹ تک جا پہنچا۔ دونوں طرف کے لوگ تھانے میں بند ہوئے۔ بڑے خاندان والے شام تک چھوٹ گئے۔ لیکن چھوٹے خاندان والوں کو گھر کی دہلیز پر قدم

رکھنے میں تین دن لگ گئے۔ لوبزا نگ گیا چوکوتو ایک مہینے کے بعد بہت مشکل سے ضمانت ملی۔

فیصلہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ دوبارہ پیٹیشن دیا گیا کہ جھرنا ہمارے گاؤں سے نکلتا ہے اور اس میں پانی بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس لئے انسانیت کے ناطے انہیں بھی پانی دیا جائے تاکہ وہ بھی آلو، مٹر اور جوُ گا کر اپنی زندگی کی گاڑی کو منزل تک پہنچا سکیں —— لیکن کورٹ کا فیصلہ اپنی جگہ اٹل رہا کہ ''بغیر سرکاری منظوری کے کوئی بھی قدرتی پانی کے بہاؤ کا رُخ نہیں موڑ سکتا۔ اس لئے اس کا رُخ پہلے کی طرح ہی کر دیا جائے۔ ''

یہ معاملہ اسپیتی کے ایک گاؤں لالنگ میں ہوا تھا۔ رکبر، حِکّم، مانے، سگ نم، تابو، ہرُ لنگ، ڈیمیول، کُنگری، رنگریک، حل، کی، لوسر اور دوسرے گاؤں والوں نے اسے صرف دو گاؤں کے درمیان کی لڑائی کے طور پر دیکھا۔ اس لئے چھوٹے اور بڑے خاندان کے درمیان کی دوری اتنی ہی رہی اور گہری نہیں ہوئی۔ ورنہ پوری اسپیتی میں کشیدگی پھیل جاتی اور تنازعات کی آگ اسپیتی کو جلا کر راکھ کر دیتی۔

کال چکر شروع ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ کازا میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی تھی۔ اسپیتی میں دو ہی مواقع ایسے ہوتے ہیں جسے سارے اسپیتی والے ایک ساتھ مل کر مناتے ہیں۔ ایک 'لدار چا فیئر' اور دوسرا 'کال چکر'—— لدار چا کو اسٹیٹ فیئر کا درجہ حاصل ہے۔ ہر سال منائے جانے والے اس سہ روزہ میلے میں صرف ہماچل ہی نہیں ملک کے کونے کونے سے آئے کلاکار گیت سنگیت اور ڈانس کا خوبصورت مظاہرہ کرتے ہیں..... کال چکر پانچ الگ الگ گومپاؤں، کی، ڈنکھر، کنگری، تابو، اور حِکّم میں ہر دو سال کے بعد منایا جاتا ہے۔ حِکّم کے اندر ہی کازا گومپا آتا ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ بات طے پائی کہ 'کال چکر' کے پہلے ہی دن سارے لوگ خفیہ طریقے سے ندی کے کنارے والے میدان میں جمع ہوں گے —— میدان کے انٹرنس پر دو چار لوگوں کو بڑے خاندان کی چوکسی کے لئے رکھا گیا تھا۔ جب

اطمینان ہو گیا کہ سب چھوٹے خاندان والے ہیں تب لوبزانگ گیا چو نے بات شروع کی۔
''کال چکر میں شامل ہونا ہم بدھشٹوں کے لئے بہت ہی سوبھاگیہ کی بات ہے۔
جو ایک بار سچے من سے شریک ہو گیا؛ سمجھو اُس کے سارے پاپ دُھل گئے۔ اِس لئے یاد رکھو کہ جب ہم میں سے کچھ لوگ روداد سونپنے کے لئے دلائی لاما جی کے پاس جائیں گے تو ہر حال میں دو باتیں ہوں گی؛ یا تو دلائی لاما جی ہماری حمایت میں جائداد کی تقسیم کا فرمان جاری کردیں گے۔ یا صدیوں سے چلی آ رہی غیر منقسم جائداد کی پاسداری کرتے ہوئے کوئی دھارمک کتھا سنا دیں گے......دونوں صورتوں میں کسی ایک کو تکلیف ضرور ہوگی۔ اگر معاملہ ہمارے خلاف گیا تو اس بات کا خیال رکھیں گے کہ کسی کے چہرے پر شکن تک نہ آئے۔ اور اگر ہمارے حق میں ہوا تو بھی خوشی کا اظہار کھلے عام نہیں کریں گے۔ ورنہ جس کے وراثتی خزانے میں سیندھ لگے گی وہ تو غصّے میں پلٹ وار کرے گا ہی۔ اس لئے سارے لوگ وہاں ایک ساتھ بیٹھیں گے۔ ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیچھے سے آئیں گے۔''

کہتے ہیں نا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ایک سے دو۔ دو سے تین۔ سٹیلائٹ کے دور میں یہ خبر منٹوں میں بڑے خاندان کے اہم لوگوں تک پہنچ گئی.....پھر منصوبہ بند طریقے سے یہ طے ہوا کہ جس طرح سے بھی ہو سکے سیکورٹی گارڈ کو گمراہ کیا جائے کہ گذشتہ رات چینی گورنمنٹ کے اشارے پر ایک چینی دہشت گرد دلائی لاما کو ختم کرنے کے لئے تبّتی راستوں سے اسپیتی میں داخل ہوا ہے۔

یہ معلوم ہوتے ہی سیکورٹی پوری طرح سے ہائی الرٹ ہو گئی۔ جگہ جگہ گاڑیوں کو روک کر تلاشی لی جانے لگی۔ ہوائی پٹرولنگ بھی شروع ہو گئی۔

'کال چکر' شروع ہونے سے پہلے ہزاروں لوگ دلائی لاما کے پروچن سننے کے لئے وہاں جمع ہوئے تھے۔ لوبزانگ گیا چو بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس طرف بڑھ رہا تھا۔ کال چکر کے پورے احاطے کو سیکورٹی والوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ مین گیٹ پر سیکورٹی کے جوان مشین گن اور رائفلیں لئے مستعدی سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے اور ہر آنے جانے والے پر نظر رکھ رہے تھے۔ وہ شخص بھی جس نے اس چینی

دہشت گرد کو تبّت کے پہاڑی راستوں سے اسپیتی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا وہ بھی اس وقت سیکورٹی کے اعلی افسروں کے ساتھ مین گیٹ پر کھڑا تھا۔اس کی نظر جیسے ہی سامنے سے آتے ہوئے لوبزانگ گیاچو پر پڑی اس نے اشارہ کر دیا۔سیکورٹی کے جوانوں نے چلاّ کر اسے وہیں رکنے کی تاکید کی۔اس میں سے ایک جوان اس کی طرف تیزی سے لپکا ۔لیکن لوبزانگ گیاچو کو اس وقت دلائی لاما سے ملنے کی جلدی تھی۔وہ سیکورٹی کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔اس کوشش میں اس نے جوان سے ہاتھا پائی کر لی۔

تین گولیاں سیدھے اسکے سینے میں اُتر گئیں۔دونوں ساتھی بھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ چاروں طرف افراتفری مچ گئی۔کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔آسمان میں ہیلی کاپٹروں کا گشت اور تیز ہو گیا تھا۔گھڑسواروں کا دل بھی وہاں پہنچ گیا۔سیکورٹی کا گھیرا اور مضبوط ہو گیا۔

لوبزانگ گیاچو کی لاش کی تلاشی لی گئی۔جیب سے بھوٹی میں لکھا دلائی لاما کے نام ایک خط ملا۔جانچ کے بعد سیکورٹی کے اعلی افسروں نے اسے دلائی لاما کے پاس پہنچایا، یا نہیں، یہ تو پتہ نہیں......لیکن سورج ڈوبنے کے بعد، پہاڑوں پر جمی صدیوں کی برف کو اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ چینی دہشت گرد کی شناخت کرنے والا شخص کوئی اور نہیں لوبزانگ گیاچو کا بڑا بھائی تھا، جسے اُس کے دوسرے بھائی نے لوبزانگ گیاچو کی موت کی سازش رچنے کے جُرم میں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

نئے ’کال چکر‘ کی اس گرمی سے صدیوں کے ’ گلیشیئر ‘ کو تو پگھلنا ہی تھا۔

☆

بوڑھے اطہر علی خاں لان میں بیٹھے یادوں کے البم سے گھر کی پرانی تصویریں نکال کر دیکھ رہے تھے کہ عین اُسی وقت اُن کا بیٹا وہاں پہنچ گیا۔ اور جب اُنہوں نے بھی گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ خوشی سے پاگل ہو اُٹھے۔

''بیٹا تم نے یہ کیا کہہ دیا۔؟ اب جتنی جلدی ہو کاغذات تیّار کر لو۔ میں جلد سے جلد ہندوستان جانا چاہتا ہوں۔''

سرفراز علی آزاد ایک مشہور فکشن رائٹر تھے۔ کئی کتابیں تھیں اُن کی۔ متعدّد ایوارڈ مل چکے تھے جب وہ یونیورسیٹی سے ریٹائر ہوئے تب انہوں نے سب سے پہلے آٹو بائیو گرافی لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن جب بھی وہ لکھنے بیٹھتے۔ پریشان ہو جاتے۔ اُنہیں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں سے شروع کریں۔؟ پیدائش تو ہندوستان کی ہے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اپنی جائے پیدائش کو دیکھیں، محسوس کریں اور تب قلم اُٹھائیں تاکہ اُن کے بیان میں سچّائی اور تحریر میں شگفتگی آ سکے۔

قریب تین مہینے کے اندر تمام کاغذات تیّار ہو گئے۔ جب گھر سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے، تب اُن کا پوتا شاہنواز علی جنّاح بھی ان کے ساتھ تھا۔ اطہر علی خاں کی آنکھوں میں اُس وقت گھر کی تصویریں ناچ رہی تھیں۔

جب ٹرین ہندوستانی سرحد میں داخل ہوئی تو اُنہیں ایک طرح کی گونا گوں راحت کا احساس ہوا۔ وہ خیالوں کی دُنیا میں کھو گئے.....

بٹوارہ اور بٹوارے سے پیدا ہونے والے حالات کو دنیا کی تمام قوموں نے کم وبیش ایک ہی طرح سے جھیلا ہے۔ کچھ ایسے ہی ناگُفتہ بہ حالات سے نبرد آزما ہوکر وہ دسمبر سینتالس کی کڑکڑاتی ہوئی سردرات میں لاہور پہنچے تھے۔ جہاں رہائش کے لئے اُنہیں ایک ہندو کا گھر الاٹ کیا گیا تھا۔

آج بھی وہ دن اُنہیں اچّھی طرح یاد ہیں۔ حالات ناگزیر ہو گئے تھے۔ مولانا آزاد سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ پاکستان جانے کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن ایک ڈھلتی ہوئی شام کا سورج ابھی پوری طرح سے زرد ایا بھی نہیں تھا کہ اُن کا دوست ہانپتا کانپتا وہاں آیا ـــــ ''اطہر میرے یار! جب سے پیشاور اور لاہور سے ریل گاڑیوں میں لاشیں بھر کر آئی ہیں، تب سے یہاں کے لوگوں کے دماغ میں بارود بھر گیا ہے۔ محلّے کے سارے مسلمان پہلے ہی گھر چھوڑ کر پاکستان چلے گئے ہیں۔ اس لئے اچّھا ہوگا کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ رات بھر میں کہاں کیا ہو جائے گا بتانا مشکل ہے۔''

اُس وقت تک اطہر علی خاں کو بھی حالات کی سنگینی کا علم ہو چکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ رات کے اندھیرے میں گُم ہوتے، بجرنگ بلی کے نعرے لگاتے ہجوم نے اُنہیں گھیر لیا، اقبال سنگھ نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر اطہر علی خاں، ان کی بیوی اور بچّے کو کرپان کی دھار پر پولس اسٹیشن تک پہنچایا۔ جہاں سے انہیں کیمپ میں بھیج تو دیا گیا، لیکن اقبال سنگھ کا کیا ہوا۔؟ وہ کہاں گیا۔؟ یہ اب تک ایک معمّہ بنا ہوا ہے۔

لاہور سے دہلی تک کا سفر کیسے طے ہوا۔ اطہر علی خاں کو پتہ ہی نہیں چلا۔ اُنہوں نے جامع مسجد کے پاس ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ پہنچتے ہی شام ہو گئی تھی۔ تھکے ہارے تھے اِس لئے دوسرے دن ناشتے کے بعد وہ گھر کی تلاش میں نکلے۔ ایک دو اور پھر

پورے بارہ دن تک اُنہیں گھر کا کوئی سراغ نہیں ملا —— تیرہویں دن ہوٹل سے نکلتے ہی اطہر علی خاں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ آج وہ آخری بار گھر ڈھونڈنے نکل رہے ہیں۔ کیوں کہ پندرہویں دن پاکستان لوٹ جانا تھا۔ چودہویں دن مارکیٹنگ کا پروگرام تھا۔ آج وہ پورا شہر چھان مارنے کے ارادے سے نکلے تھے۔ لیکن پرانی عمارتوں کی جگہ بنی عالی شان عمارتوں اور سڑکوں کے مکڑ جال نے اُن کے حوصلے پست کردئے تھے۔ سب کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ آٹو رکشے پر چلتے چلتے وہ تھک گئے تھے۔ مایوسی نے اُن کے قدم جکڑنے شروع کردئے تھے۔ اور اب وہ لوٹنے ہی والے تھے کہ یکا یک چمتکار ہوگیا۔

''مل گیا.....''

اطہر علی خاں زور سے چلاّئے اور لگ بھگ رکشے سے بوڑھے پاؤں پر کود گئے۔ دونوں نے جلدی سے پکڑا۔ لیکن وہ تو دوسری دنیا میں تھے۔ اِسلئے وہ بہت دیر تک حیران وششدر وہیں کھڑے رہے۔ ساٹھ سالوں میں پوری دلّی بدل گئی تھی۔ لیکن اُن کا گھر آج بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا وہ چھوڑ گئے تھے —— سرفراز علی آزاد نے فوراً کیمرہ سنبھال لیا۔ اُس وقت شاہنواز اُس گھر کو کم، اونچی اونچی عمارتوں کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔

اطہر علی خاں کے بوڑھے پاؤں میں گرماہٹ آگئی تھی۔ وہ دونوں سے پہلے سڑک پار کر کے گھر کے قریب پہنچ گئے اور جذبہء سرشاری میں دیواروں کو چھونے لگے۔ اُس وقت اُن کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ وہی دیواریں، وہی لکھی ہوئی آیتیں، وہی ستون اور اُن پر بنے وہی گُل بوٹے ...... پھر دھیرے دھیرے اطہر علی خاں برآمدے کے سامنے آگئے۔ وہ دونوں بھی اُن کے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔ وہاں سے سامنے والے کمرے کا منظر پردہ سرک جانے کی وجہ سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں پلنگ پر لیٹا ہوا ایک بوڑھا وکیل سے کہہ رہا تھا۔

''یہ گھر مجھے پارٹیشن کے بعد رہنے کے لئے ملا تھا۔ یوں سمجھو کہ یہ کرائے کا گھر ہے۔ معقول کرائے کی ایک رقم تب سے لے کر اب تک بینک میں جمع بھی کرتا آیا ہوں۔ چونکہ یہ

گھر میرا نہیں ہے۔ اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد اِس گھر کے مالک یا حقیقی وارث کو جو یقیناً پاکستان میں ہیں۔ اُس کا پتہ کورٹ اپنے طور لگائے اور لیگل پروسیس کے تحت یہ گھر اُن کے حوالے کرے۔ تاکہ میری آتما کو شانتی ملے۔''

جئے کمار کو اپنے باپ کی وصیّت کے بارے میں پہلے سے علم تھا۔ لیکن جب پہلی بار رام کمار کو معلوم ہوا تو وہ دل ہی دل میں دادا کو پاگل قرار دینے لگا ـــــ باپ کے ڈر سے کچھ دیر خاموش رہا۔ لیکن کب تک خاموش رہتا۔ یکا یک اندر کی ناراضگی اُبل پڑی۔

''دادا گھر آئی لکشمی کو ٹھکرایا نہیں جاتا۔ اور اس پر ستم یہ کہ آپ کرایہ بھی جمع کر رہے ہیں.....؟''

ستّیہ کمار نے مسکراتے ہوئے پوتے کو اپنے پاس بٹھایا۔ سر پر ہاتھ رکھا اور سمجھایا۔ ''جس گھر کو میں نے بنایا ہی نہیں، وہ میرا کیسے ہوسکتا ہے۔؟ جس کا ہے اگر اُسے اتنے سالوں بعد مل جائے تو اَغوا ہوئی اولاد کو پانے جیسی خوشی ملے گی۔ کتنی دعائیں دے گا وہ۔ یہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''لیکن دادا ! بٹوارے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس کے پاس جو آگیا وہ اُسی کا ہو گیا۔'' پھر کچھ رک کر طنزیہ لہجے میں۔ ''وہ جسے آپ نے بنایا تھا وہ کسی پاکستانی کے قبضے میں ہی ہوگا نا...؟ پہلے یہ بتایئے کہ اُس نے کبھی آپ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی.....؟ پھر ہم کیوں لوٹائیں.....؟''

بیٹے کی اِس حرکت پر جئے کمار نے اُسے ڈانٹ پلائی ـــــ ''جب اُن کا فیصلہ مجھے منظور ہے تو تمہیں اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ بلکہ تمہیں تو اُن کی آئیڈیالوجی پر فخر ہونا چاہیے۔''

اطہر علی خاں بیٹے اور پوتے کے ساتھ اندر کی ساری باتیں سُن چکے تھے۔ اُس وقت وہ دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے اور بوڑھے سے جلد سے جلد ملنے کے لئے بے تاب تھے۔ لیکن آواز دینا مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔ تبھی بوڑھے کا بیٹا وکیل کو چھوڑنے باہر آیا۔

اطہر علی نے اُسے اپنے بارے میں بتایا۔ کچھ دیر بعد بوڑھے کو جب یہ معلوم ہوا کہ پاکستان سے اطہر علی خاں آئے ہیں تو اُن کی سانسیں تیز ہوگئیں۔ بولے۔ ''جا کر پوچھ کے والد کا کیا نام ہے۔؟'' جب نام بتایا گیا تو دل دھونکنی کی طرح دھڑ کنے لگا۔ ''انہیں اندر بٹھاؤ۔'' جلدی میں انہیں چپّل بھی نہیں مل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ملی بھی تو پیروں میں سمانے میں وقت لگا۔

وہ تینوں ہال میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ اطہر علی خاں نے دیکھا کہ طاق میں قُرآن شریف اُسی جگہ رکھا ہوا ہے جہاں انہوں نے رکھ چھوڑا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کی بوڑھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پاور لگے چشمے کے شیشے کو انہوں نے صاف کیا —— بیٹے کو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ تیس سالہ پوتا اِن باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ لیکن وہ اتنا تو سمجھ ہی رہا تھا کہ یہ گھر اب بھی دادا کے نام سے ہے۔ اور اگر بٹوارہ نہیں ہوا ہوتا۔ پاکستان نہیں بنتا۔ وہ بھی اسی گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ یہیں رہتا۔

ہندوستانی دادا لاٹھی ٹیکتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے اور سیدھے پاکستانی دادا کے گلے سے لگ گئے۔ دیر تک دونوں کی آنکھوں کے کنارے رِستے رہے۔

''کیا حال ہے بھئی میرے لاہور کا.....؟'' ستیہ کمار کی آواز میں وطن چھوڑنے کا درد نمایاں تھا۔ وہ وہاں کے بارے میں جاننے کے لئے بے تاب تھے۔

''سب ٹھیک ہے....'' اطہر علی خاں نے اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔

''اطہر میاں! میں نے آپ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ ہر اُس شخص سے جو پاکستان آتا جاتا تھا، اُس سے میں تمہارا ذکر کرتا تھا۔ لیکن کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔'' پھر وہ کچھ وقفے کے لئے رُکے اور اپنے پوتے سے کہا۔ ''رام کمار بیٹا! ہاتھ منہ دھونے کے لئے پہلے پانی وانی لا۔ اور اندر جا کر اپنی ماں سے کہہ کہ مکان مالک آئے ہیں۔ اِس لئے کچھ اچھا اچھا کھانا بنا۔ ورنہ پاکستان میں ہندوستانی ذائقے کی بڑی بدنامی ہوگی۔''

ستیّہ کمار جی! یہ کھانا وانا تو ٹھیک ہے، لیکن مکان مالک کہہ کر آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ بھئی ہم لوگ تو آپ کے مہمان ہیں۔'' پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے اُنہوں نے بیٹے کی طرف اِشارہ کیا۔ ''یہ ہے میرا اکلوتا بیٹا آزاد۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو اسی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ رائٹر ہے۔ سوانح عمری لکھ رہا ہے۔ اُس کی خواہش تھی کہ اپنے ہندوستان والے گھر کو دیکھوں۔ اور وہ میرا پوتا ہے۔ شاہنواز علی جنّاح۔''

''یعنی اگر بیٹا جیونی نہیں لکھ رہا ہوتا تو آپ کبھی یہاں نہیں آتے۔؟'' ستیّہ کمار نے سوال کی ایک چھوٹی سی انّی پھینکی جو سیدھے اُن کے سینے میں اُتر گئی۔

''ہاں ایسا ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ بہت سارے زخم.....'' کہتے کہتے اُنکا بوڑھا جسم کپکپانے لگا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور پھر بہت سارے بھیگے مناظر آنکھوں کے اِسکرین نما اسٹیج پر محوِ رقص ہو گئے۔

کیمپ کا دوسرا دن تھا۔ سامان چوری ہو گیا تھا۔ دو تین دن تک کھانا جیسے تیسے کر کے مل گیا۔ لیکن جیسے جیسے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ کھانے پینے میں بدنظمی آتی چلی گئی۔ جب بھی بدنظمی بڑھتی۔ منتظمین کھانا تقسیم کرنا بند کر دیتے۔ اِس کے بعد جو پیسہ یا زیور لے کر رسوئی جاتا، اُسے چھپا کر کھانا دے دیا جاتا یا اندر ہی کسی کونے میں بٹھا کر کھلا دیا جاتا۔ چار ماہ کے سرفراز کو دودھ نہیں ملنے کی وجہ سے اُس کا بُرا حال تھا۔ کھانے کی کمی سے بیوی کے سینے میں دودھ کے سوتے سوکھ گئے تھے۔ اُس روز اُن کے پاس نہ پیسے تھے اور نہ زیورات ہی جسے وہ رسوئی میں آگ کی نذر کرتے۔ گھنٹوں لوگوں کے ہاتھ پاؤں جوڑنے کے بعد اُنہیں تھوڑا سا کھانا مل پایا تھا۔ جب وہ لوٹے تو دیکھا کہ سرفراز دودھ کے لئے تڑپ رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُن کی بیوی کسی منتظم کے ساتھ دودھ لینے کے لئے رسوئی تک گئی ہے۔ وہ بچّے کو لے کر اِدھر اُدھر دوڑتے رہے۔ لیکن اُن کی بیوی کا کہیں کوئی پتہ نہیں چلا —— دوسری صبح کیمپ کے باہر رسوئی کی دوسری جانب منتظمین کی آرام گاہ کے پچھواڑے اُس کی لاش برہنہ حالت میں پائی گئی۔ جسے شام ہوتے ہوتے ندی کے کنارے

بغیر کفن کے دفن کر دیا گیا۔

اطہر علی خاں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ستیہ کمار نے چپ کرانے کی بہت کوشش کی۔ اِس کوشش میں کامیاب ہوئے تو اُن کی آنکھوں کے مضبوط بندھ خود بخود ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا سیلاب اُنہیں بھی بہا کر دور بہت دور ماضی کی ایک ایسی دنیا میں لے گیا، جہاں پہنچتے ہی وہ خود میں کھو سے گئے۔

جب وہ پشاور ایکسپریس میں سوار ہو کر ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے تو ان کی ٹرین کا حال کرشن چندر کی پیشاور ایکسپریس جیسا ہی تھا۔ راستے میں چند شرپسند نوجوانوں نے اُن کی بیوی اور چودہ سالہ بچّی کو اُن کے سامنے گھسیٹ کر پلیٹ فارم پر اُتار لیا —— ۔مزاحمت کرنے پر اُنہیں مار مار کر ادھ مرا کر دیا۔ وہ وہیں گر پڑے۔ لیکن کچھ دیر بعد جیسے تیسے کر کے اُٹھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو پلیٹ فارم کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ دوسرے کمپارٹمنٹ سے بھی کئی عورتیں اور لڑکیاں اُتاری گئی تھیں۔ جنہیں بے شمار بھیڑئے چاروں طرف سے نوچ رہے تھے۔ قریب دو گھنٹے تک ٹرین وہاں رکی رہی۔ درندوں نے اُن کی بیوی کو ہوس کا شکار بنانے کے بعد بڑی بے رحمی سے اُن کے دونوں سینے کاٹ لئے تھے۔ خون سے وہ لت پت پلیٹ فارم پر تڑپ رہی تھی —— دوسرے پلیٹ فارم پر اُس کی کمسِن بیٹی کئی ایک جوانوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اُس کی چیخ بھی سہی سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ لیکن واہ رے اُس کی ہمّت کہ اُس نے کئی کو دانت کاٹ کر زخمی کر دیا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی۔ لیکن کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ آخر میں ایک درندے نے اُس کے پھول سے بدن کے پھول سے انگ پر بھالے سے وار کیا۔ خون کا فوّارہ اُٹھا جسے دیکھنے کی تاب ستیہ کمار میں نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔

ستیہ کمار کی آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔ اطہر علی اُنہیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ دیر تک ہال میں خاموشی سی چھائی رہی۔ پھر اُنہوں نے روہانسی

آواز میں کہا۔

''اطہر میاں! کیا بٹوارہ اتنا ہی ضروری تھا۔؟ تم نے اپنے جنّاح کو کیوں نہیں سمجھایا کہ پاکستان کی ضد چھوڑو۔ ورنہ دونوں طرف کے لاکھوں لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اپنے گھر سے بے گھر ہو جائیں گے۔''

''ستیّہ کمار جی آج کون کس کی بات سنتا ہے۔'' اطہر علی خاں نے طنزیہ لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''گاندھی، نہرو، آزاد اور دوسرے نیتاؤں کو جب اس بات کا علم تھا کہ جنّاح چند ہی روز کے مہمان ہیں، تو پھر اُن رہنُماؤں نے دوراندیشی سے کام کیوں نہیں لیا؟ کچھ دن کے لئے وزیراعظم بنا دیتے تو ملک کا بٹوارہ تو نہیں ہوا ہوتا نا؟ اگر آج ایک ہوتے تو چاند کیا، سورج بھی ہماری مُٹھی میں ہوتا۔''

''ہاں۔!'' ستیّہ کمار نے اپنے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے اُن کی باتوں پر صداقت کی مہر لگائی۔ ''لیکن جو ہو گیا، اُس کا کیا کیا جائے؟ اب سے بھی ہمارے سیاسی رہنُما صِدق دل سے ایک دوسرے کے قریب آ جائیں تو نہ دوبارہ اکہتّر کی خوں ریزی ہوگی۔ نہ کشمیریوں میں دہشت پھیلے گی۔ اور نہ کبھی کارگل ہوگا۔''

''بات تو سولہ آنے سچ کہی ہے آپ نے۔'' اطہر علی کی آنکھیں کچھ بڑی ہو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ ''لیکن اگر اکہتّر نہیں ہوا ہوتا تو کبھی کارگل نہیں ہوتا۔ چوں کہ اکہتّر ہوا ہے اور ابھی بنگلہ دیش کا زخم پاکستان کے سینے میں تازہ ہے۔ اس لئے اِس کے ردِّعمل میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے نپٹنے کے لئے ہندوستانی حکومت جتنی بھی فوجیں سرحد پر تعینات کر دیں۔ لیکن کشمیر آزاد ہو کر رہے گا۔''

دوپہر کے کھانے میں کئی طرح کے پکوان بنائے گئے تھے۔ سب نے سیر ہو کر کھایا۔ اطہر علی نے کھانے کی بہت تعریف کی۔ کھانے کے فوراً بعد رام کمار کے ساتھ شاہنواز 'مائی نیم از خان' دیکھنے کے لئے نکل گیا۔ وہ ہندوستانی فلموں اور خاص طور سے شاہ رخ خان کا بہت بڑا فین تھا۔ اطہر علی خاں، ستیّہ کمار کے ساتھ اُن کے کمرے میں

آرام کرنے چلے گئے۔

سرفراز علی آزاد اور جئے کمار وہیں ہال میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ایک ادیب تھا تو دوسرا آرٹسٹ۔دونوں کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ جس ملک میں پیدا ہوئے ہیں، اُس ملک نے اُنہیں پناہ نہیں دی۔دونوں کی حالت اُس وقت اُس بچّے کی طرح تھی جسے مائیں جنم دے کر دوسرے کو گود دے دیتی ہیں......گود لئے بچّے چاہے کچھ بھی بن جائیں اُنہیں عدم تحفُّظ کا احساس ہمیشہ ستاتا رہتا ہے کہ کہیں....؟ یہ دونوں بھی ہمیشہ اندر ہی اندر ڈرے سہمے سے رہتے کہ کہیں دونوں ممالک کے درمیان جنگ نہ چھڑ جائے۔اِس سے بچنے کے لئے دونوں ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔

''جنگ مسائل کو جنم دیتی ہے ختم نہیں کرتی.....''

''اصل میں ہم ختم کرنا نہیں چاہتے۔اگر جغرافیائی حدود کا خیال رکھیں۔کشمیر کی دانستہ اوور لیپنگ سے اجتناب برتیں۔اور اپنے اپنے ملک کے نقشے کو درست کر لیں۔تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔''

''جئے کمار جی! اِس طرح کے کئی اہم مسئلوں پر ہمارے رہنُما شملہ، لاہور اور آگرہ سمجھوتے کر چُکے ہیں۔بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی یہ مدّے اُٹھائے گئے ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ عالمی ادارے اِس مسئلے کو سلجھا سکیں گے۔؟ جو خود کٹھ پتلی ہیں ''—
سرفراز علی خاں نے یہ کہہ کر عالمی امن اداروں کے وجود پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

''آپ نے بالکل سہی کہا ہے ۔'' جئے کمار نے اُن کی بات کو کچھ اور آگے بڑھائی ۔'' ورنہ لاکھوں فلسطینیوں ،لبنانیوں ،افغانستانیوں اور عراقیوں کی جانیں بے موقع و محل نہیں جاتیں۔صدّام کو پھانسی نہیں ہوتی۔''

''رام کمار اور شاہنواز جب فلم دیکھ کر لوٹے تو اُسی بائک سے جئے کمار اور سرفراز علی

آزاد کتاب بازار گئے۔ سرفراز کو گیان پیٹھ اور ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ کتابیں خریدنی تھیں دونوں کے ہال سے باہر نکلتے ہی دونوں کے صاحبزادے دونوں کی جگہوں پر دوبارہ براجمان ہو گئے۔

شاہنواز پالٹیکل سائنس میں پی جی تھا تو رام کمار نے شدّت پسند گیروا پارٹی جوائن کر رکھا تھا۔ اِس لئے فوراً سیاست پر گفتگو شروع ہو گئی۔ موضوعِ بحث تھا۔ فوجی حکمراں، دہشت گردی، لائن آف کنٹرول، مقبوضہ کشمیر، آئی ایس آئی، جماعت اسلامی، آر ایس ایس، اکھر دھام، لال قلعہ اور بابری مسجد.....

''اکثر تمہارے فوجی حکمراں ڈرانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں....؟'' بات ہی بات میں رام کمار نے شاہنواز سے پوچھ ہی لیا۔

''تم جو بھی کہو۔ لیکن سچّائی یہ ہے کہ پہلے تم نے پوکھران کا دھماکہ کیا۔ ہم نے تو صرف جوابی کارروائی کر کے بتایا کہ ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔''

اِس دوران جئے کمار اور سرفراز علی آزاد بازار سے لوٹ آئے تھے۔ دونوں کو سیاست پر گفتگو کرتے دیکھ کر جئے کمار بھی میدان میں کود پڑے۔

''جواب تو دونوں حکومتوں کا نہیں ہے۔ دونوں کے یہاں کسان خودکشی کر رہے ہیں۔ لوگ غریبی سے مر رہے ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے پر سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے ایٹمی طاقت کو بڑھانے میں رات دن پاگل ہو رہے ہیں۔''

''اسلحے کبھی ملک کی ترقی کے ضامن نہیں ہو سکتے۔'' سرفراز علی خاں نے بھی اپنا موقّف ظاہر کیا۔ ''اِس پر جتنے پیسے خرچ کئے جا رہے ہیں اگر اس کا آدھا حصّہ بھی غریبوں کے لئے مختص کر دیا جاتا تو دونوں ملکوں کی خوشحالی کا گراف آج کچھ اور کہانی بیان کر رہا ہوتا۔ لیکن افسوس...؟''

جئے کمار، سرفراز علی آزاد کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رام کمار اور شاہنواز

دونوں کے ذہن میں اب بھی بہت سارے سوالات کلبلا رہے تھے۔ جیسے بابری مسجد بغیر کسی تاریخی شواہد اور عدالت کے فیصلے کے بغیر کیوں توڑ دی گئی۔؟ ہائی کورٹ کا فیصلہ آیا تو بابری مسجد اور رام جنم بھومی میں آدھا آدھا نہیں بٹ کر تین حصّے میں کیسے بٹ گیا۔؟ کیا مدرسے دہشت گردی کے اڈّے نہیں ہیں۔؟ لال مسجد میں جو ہوا وہ کیا تھا۔؟

ستّیہ کمار اور اطہر علی خاں دوسرے کمرے سے لیٹے لیٹے سب کچھ سن رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ نئی نسل 'پاکستان' کا مطلب ..... 'دہشت گرد' اور 'ہندو' کا مطلب 'ہندوستانی مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والا' کیوں سمجھتی ہے۔؟ ایک دوسرے کو ہمیشہ شک کی نگاہ سی کیوں دیکھتی ہے۔؟ اس پر اطہر علی خاں نے افسوس کا اِظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اِس میں قصور نئی نسل کا نہیں، حکومت کا ہے۔ ہمارے دانشوروں کا ہے۔ جنھوں نے بٹوارے کو ہندو مسلم کی نگاہ سے دیکھا اور ہندی، اردو کے لئے الگ الگ نصاب تیّار کئے۔ ہمارے پاکستان میں جو نئی نسل ہے وہ گاندھی نہرو اور آزاد کو نہیں جانتی۔ یا پھر وہ اہمیّت نہیں دیتی۔ جب کہ یہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے۔''

''ہمارے یہاں بھی جنّاح اور ان کے حمایتیوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بڑے بڑے مسلم رہنُماؤں پر ادنیٰ قسم کے رہنُما کو فوقیت دی جاتی ہے۔ حامد جیسے جاں بازوں کو مثال بنا کر پیش نہیں کیا جاتا۔ جب تک نئی نسل مشترکہ کارناموں سے روشناس نہیں ہوگی، تب تک وہ حقیقت سے بعید ایک دوسرے سے نفرت کرتی رہے گی ـــــ جلیاں والا باغ کے کلپرٹ مائکل اوڈائر کو قتل کرنے والے اودھم سنگھ کی باقیات کو 'پینٹن ویلے' لندن کے کوئنک لائم یارڈ سے نکال کر سرکاری اعزاز کے ساتھ آزادی کے فوراً بعد بھارت لایا جاتا ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہیرو، مغل سمراٹ بہادر شاہ ظفر کی باقیات کو آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی رنگون سے دہلی نہیں لایا جا سکا ہے۔ آخر کیوں۔؟''

دوسرے دن مارکیٹنگ کے لئے تینوں باہر نکلے۔ ڈھیر سارے تحفے تحائف رشتہ داروں اور دوستوں کے لئے خریدے گئے۔ واپسی میں ہوٹل سے سامان بھی لیتے

آئے۔ اُس رات کھانے کے بعد سبھی ستیّہ کمار کے کمرے میں موجود تھے۔ دورانِ گفتگو ستیّہ کمار نے موقع غنیمت جان کر وہ بات بھی کہہ دی جسے کہنے کے لئے وہ برسوں سے بے چین تھے۔

''اطہر میاں! زندگی اور موت کا کیا ٹھکانا۔ آج ہوں کل نہ رہوں۔ پھر نئی نسل کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب ہمیں بھول جائے۔ اِسلئے میں نے وکیل کو بلوایا تھا۔ لیکن اب جب آپ خود آ گئے ہیں تو اس کی کوئی ضرورت نہیں —— میں نے گھر کے سارے کاغذات سنبھال کر رکھے ہیں۔''ستیّہ کمار نے پلنگ کے نیچے سے زنگ آلود صندوق کھینچا۔ اسے زنجیر سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اس میں سے انہوں نے گھر کے کاغذات اور بینک کی پاس بُک نکالی اور اطہر علی کی طرف بڑھا دیا۔''جب تک میں اِسے آپ کے حوالے نہیں کرتا۔ چین سے موت بھی مجھے گلے نہیں لگاتی۔''ستیّہ کمار کی اِس بات پر پہلے اطہر علی خاں مسکرائے پھر بولے۔

''میں کیا کروں گا اِسے لے کر۔؟ مجھے نہیں چاہیئے یہ سب۔ کیا یہ کم ہے کہ آپ نے میرے سپنوں کو سنجو کر رکھا ہے۔ اور میں اتنے سالوں بعد اپنے اُس گھر کو اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ جس میں چھوڑ گیا تھا۔'' یہ کہتے ہی اطہر علی خاں کی آنکھیں شکریہ کے انداز میں جھک گئی تھیں۔

ستیّہ کمار اس سے پہلے کہ کچھ کہتے شاہنواز دادا کے سامنے آ جاتا ہے۔

''دادا جان! ستیّہ دادا جب خوش دلی سے آپ کو آپ کی چیز لوٹا رہے ہیں تو پھر لینے میں بُرائی کیا ہے۔؟''

دوسری طرف رام کمار کروڑوں کی جائداد کو اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھ کر اندر ہی اندر پریشان ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں دادا سے کہتا ہے ——''برسوں سے جب آپ اِس گھر کی حفاظت کر رہے ہیں تو پھر آگے آپ کو کیا پریشانی ہے۔؟ میں ہوں نا آپ کی دیکھ بھال کے لئے...''

اُس وقت جئے کمار عجیب کشمکش میں پھنس گئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا

تھا کہ وہ کیا کریں۔؟ باپ کی حمایت کریں یا بیٹے کی حرکت پر اُسے ڈانٹیں۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے نئی اور پرانی نسل کے درمیان ترازو بن کر جھول گئے۔

''پاپا ! ایسا کیوں نہیں کرتے کہ گھر انکل کو دے دیں اور کرائے والی وہ رقم جو بینک میں ہے اُسے اپنے پاس رکھ لیں۔''

ستیہ کمار نے بیٹے کی طرف ترچھی نظر سے دیکھا۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے ،سرفراز علی آزاد نے مسکراتے ہوئے بنٹوارے کا خیر مقدم کیا ـــــ ''انکل جئے کمار ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ میرے حساب سے مناسب تو یہ رہے گا کہ.....کل چونکہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔ گھر تو لے جا نہیں سکتے اور نہ ہی اتنی جلدی میں کسی سے بیچ سکتے ہیں۔ لیکن رقم کو آسانی سے ایکسچینج کر کے پاکستان لے جا سکتے ہیں۔ اِس لئے.....''

سرفراز کی اس بات پر اطہر علی خاں برانگیختہ ہو اُٹھتے ہیں۔ ''تم اتنے بڑے رائٹر ہو کر اس طرح کی گھٹیا باتیں کر رہے ہو۔ ارے انسانیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جس طرح سے اُنہوں نے میرے گھر کی حفاظت کی ہے، مجھے اس کے عوض اُنہیں انعام دینا چاہئے اور تم ہو کہ.....؟''

دادا کی اس بات پر شاہنواز نے ایک زوردار ٹھہا کا لگایا اور اندر ہی اندر کچھ بُد بُدایا۔ پھر وہ کچھ دیر تک ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ سوچتا رہا کہ اُس کے دادا کتنے معصوم ہیں۔ گھر آئی دولت کو لات مار رہے ہیں۔ اُسے رونا آرہا تھا ـــــ دوسری طرف رام کمار یہ سوچ رہا تھا: کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاکستانی دادا کا ارادہ بدل جائے۔ مفت ہاتھ آ جائے تو بُرا کیا ہے۔ یہ تو انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ دوسری ترکیب سوچنے لگتا ہے۔ پھر جھوٹی تعریف کے پُل باندھ دیتا ہے۔

''واہ دادا واہ! آپ کے اِس فیصلے نے مجھے اپنا مُرید بنا لیا ہے۔ انسان کی اگر پوجا کی جاتی تو دل کے مندر میں آپ کو بٹھا کر میں صبح و شام پوجتا رہتا۔''

''نہیں! پوجنے کے لائق تو تمہارے دادا ہیں بیٹے۔'' سرفراز علی نے کہا۔ ابھی ابھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سوانح عمری سے پہلے تمہارے دادا کو مرکزی کردار بنا کر ایک زبردست

ناول لکھوں گا۔ قسم خدا کی ایسا جیتا جاگتا کردار آج کے مطلب پرست دور میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملنے والا۔''

سرفراز علی آزاد کو جو وقت ملا اُسی میں انہوں نے اپنی سوانح عمری کے لئے تصویریں کھینچ لیں۔ یہاں کے جغرافیائی حالات اور یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے متعلق بھی بہت ساری معلومات جمع کر لیں۔ ناول کے لئے ستیّہ کمار سے اُن کی زندگی کے چند اہم پہلوؤں پر گفتگو کی۔ اُنہیں ہندوستانی عظمت کا گہوارہ قرار دیا۔ دالد کی شخصیّت بھی اُن کے لئے کسی مُعمّے سے کم نہیں تھی۔ کفایت شعاری اور پیسے کے پیچھے بھاگنے والا شخص انہیں اب سادھو، فقیر نظر آ رہا تھا۔ ناول کے ضمنی کردار بھی اُسے اس طرح گھر بیٹھے مل جائیں گے۔ اس نے سوچا نہیں تھا۔ وہ آج بہت خوش تھے۔

ویزا کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ آج تینوں پاکستان لوٹ رہے تھے۔ لوٹنے سے پہلے اطہر علی خاں نے گھر کے ایک ایک حصّے کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ آخر میں ستیّہ کمار کے کمرے میں آئے۔ اپنی گاڑھی محنت سے بنی بلیک شیشم کے پلنگ کو جس میں اب بھی وہی چمک تھی، اُسے کئی بار چھوا۔ گذرے دنوں کی یادوں کو اپنے اندر محسوس کیا ـــــ اس پلنگ پر ہی انہوں نے دلہن کا شرم سے گلنار چہرہ دیکھا تھا۔ اُسے سونے کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی مناظر اپنے بدن کھولنے لگے۔ اُن کی آنکھیں پوری طرح سے چھلک اُٹھیں ستیّہ کمار سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ لیکن خاموش تھے۔ اُن کی اِس خاموشی میں بھی کئی راز پنہاں تھے۔ وہ بھی اطہر علی خاں کے گلے مل کر خوب روئے۔ جئے کمار بھی سرفراز علی آزاد سے گلے ملتے ہی جذباتی ہو گئے تھے۔ انھوں نے تحفے میں ہندوستان و پاکستان کا نیا نقشہ پیش کیا۔ سرفراز نے بھی انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔

گھر سے نکلتے وقت ستیّہ کمار خود کو کمزور پاؤں پر گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ عورتیں

برآمدے تک آ ئیں۔ بچّے بھی پاؤں چھونے کے لئے روڈ تک آئے۔ اِس بھیڑ میں گھر کے جہاں سارے افراد تھے۔ وہیں رام کمار سر درد کی وجہ سے بام لگا کر دادا کے کمرے میں سویا ہوا تھا۔

ٹیمپو میں سامان رکھا جا رہا تھا۔ آس پاس کے دو چار لوگ بھی اُن سے ملنے آ گئے تھے۔ ستّیہ کمار نے آخری بار اِلتجا کی —"پلیز گھر کے کاغذات لیتے جا ئیں۔ "اطہر علی کی آنکھیں اُس وقت بھیگی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے ستّیہ کمار کی طرف دیکھا۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ ستّیہ کمار بھی کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر جئے کمار سے بولے۔

"بیٹے انہیں جلدی اِسٹیشن چھوڑ آ —"

اِسٹیشن پہنچتے ہی شاہنواز کو کچھ یاد آیا۔ ٹرین آنے میں کچھ دیر تھی۔ اُس نے اِس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا ۔"میں نے کل پاس کی ایک دکان سے ممّی کے لئے تحفہ پسند کیا تھا۔ سوچا تھا کہ جاتے وقت لے لوں گا۔ بس میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔"

باہر نکل کر وہ ٹیمپو میں سوار ہوا۔ راستہ بھر سوچتا رہا کہ ستّیہ دادا سے جا کر وہ کیا کہے گا۔؟ سیدھا کہے گا کہ ابّو جان آپ کے نیک جذبات کو دیکھتے ہوئے گھر کے کاغذات لینے کے لئے تیّار ہو گئے ہیں۔ لیکن کہیں اُسی وقت انہوں نے فون لگا لیا تو....؟ سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔ وہ پریشان تھا۔ لیکن اسی ادھیڑ بن میں راستہ طے ہو گیا۔

شاہنواز کو دیکھتے ہی ستّیہ کمار کے چہرے پر وقت نے صدیوں پر محیط زندگی کا غازہ مل دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ شاہنواز کیوں آیا ہے۔ ؟ پہلے مُسکرائے۔ پھر بولے بیوقوف کو میں نے اتنا سمجھایا پر نہیں مانا۔ صرف قُرآن لے کر چلتا بنا۔ لیکن بھگوان پر مجھے وشواس تھا۔ چلو اطہر میاں نہیں آئے، کوئی بات نہیں۔ میرا پوتا تو آ گیا۔"

شاہنواز کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ بغیر جھوٹ بولے بات بن گئی تھی۔ لیکن یکا یک اُس کی خوشیوں میں فورفورٹی کا گہن اُس وقت لگ گیا جب ستّیہ کمار نے جھُک کر

پلنگ کے نیچے سے اُس پرانے صندوق کو کھینچا۔ زنجیر ٹوٹی ہوئی تھی۔ قبضے کے ساتھ تالا ایک طرف جھول رہا تھا۔ اندر نہ ہی کاغذات تھے اور نہ ہی پاس بُک .....

ستّیہ کمار کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ اندر ایک بونڈ راُٹھنے ہی والا تھا .....روح کے پرنچے اُڑنے ہی والے تھے......کہ یکا یک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''دادا میں نے صندوق توڑنے کا گناہ کیا ہے۔ چیک پر جعلی دستخط کر کے کچھ پیسے بھی نکال لئے ہیں۔ لیکن بینک سے نکلتے ہی آپ کے آدرشوں نے میرے منفی خیالات کے پاؤں میں پُرانی صندوق کی وہی زنجیریں ڈال دی ہیں، جسے توڑ کے میں یہاں تک آیا تھا —— سر درد ٹھیک ہو گیا ہے۔ کیوں مجھ میں بھی آپ کا ہی خون دوڑ رہا ہے۔ اب یہاں سے میں سیدھے اِسٹیشن جا رہا ہوں کہ سب کچھ شاہنواز کو سونپ دوں۔ تا کہ کبھی ہمارا 'گھر' ہمیں آواز دے تو سامنے جانے میں 'شرمندگی' نہ ہو۔''

اُس وقت ستّیہ کمار خوشیوں سے پاگل ہوا ُٹھے تھے۔ شاہنواز کو دیر تک گلے سے لگائے رکھے۔ پھر بولے ——''تو جو لینے آیا ہے، اُسے دینے کے لئے رام کمار خود اِسٹیشن گیا ہے۔ جا بیٹا جا..... جلدی جا ..... گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔

شاہنواز چلا گیا۔

ستّیہ کمار نے اُس طاق پر جواب خالی ہو چکا تھا۔ وہاں پاکستان سے لائے ہوئے 'گیتا' کو رکھ دیا۔

اب یہ گھر اُنہیں اپنا لگ رہا تھا۔

☆

زمینی نشیب وفراز کا کھیل

زمینی نشیب وفراز کا کھیل کب سے جاری ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔ ہاں قیاس کی بنیاد پر ہم سمندر اور پہاڑ کی جلوہ افروزی کی باتیں صدیوں سے سنتے آئے ہیں کہ کبھی یہاں سمندر رہا ہوگا اور کبھی پہاڑ.....لیکن زمینی توازن کے بگڑتے ہی ایک جھٹکے میں سب کچھ تبدیل ہو گیا ہوگا۔

وہاں بھی کبھی سمندر رہا تھا لیکن اب وہ حصّہ چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا اور دنیا کا سب سے خوبصورت حصّہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اونچے اونچے پہاڑوں کے چاروں طرف بسے پورب، پچھّم، اُتّر، دکھن نے اس پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا کہ اگر جنّت نشاں اس کے قبضے میں آ جائے تو دنیا کے نقشے میں سب سے خوبصورت ملک کا درجہ پانے میں وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اور دنیا کے بے شمار سیر و تفریح کے مدّاح اس کی جانب کھنچے چلے آئیں گے۔ اس سے سرکاری خزانے میں جو غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ اس سے اس کے ملک کی اقتصادی ترقّی میں یقینی بہتری آئے گی۔ جس کے باعث اس کے کھیتوں میں ڈالر کی فصل لہلہائے گی۔ کبھی یہ حصّہ بھی بیشتر حصّوں کی طرح دنیا کے دوسرے حصّوں سے جُڑا ہوا تھا۔ لیکن زمینی جوار بھاٹا نے چاروں طرف پہاڑی سلسلے سجا کر اسے سب سے الگ کر دیا۔ جو پہاڑ کے اس طرف رہ گئے انہیں اس تقسیم نے ان کے اپنوں

کو چھین لیا تھا۔ کچھ مجبوراً پورب کے حصّے میں چلے گئے۔ تو کچھ کو پچھّم کی چکا چوندھ نے اپنی جانب کھینچ لیا۔ کچھ اُتّر کی سرد ہواؤں کے اسیر ہو گئے تو کچھ کو دکھنی سرزمین راس آئی ـــــ لیکن ان بے چاروں کو زندگی کہیں نہیں ملی۔ جب مراجعت کر کے اپنے گھر کی طرف پیش رفت ہوئے تو انہیں گھر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ اور کچھ کو ملی بھی تو چاروں طرف سرحدوں پر ایستادہ فوجی لشکروں نے شک کی بنیاد پر اسے سرحد میں گھسنے نہیں دیا کہ اب اس کے چہرے کے نقوش میں پورب پچھّم، اُتّر دکھن کی مشابہت جھلکنے لگی تھی۔

زمینی نشیب و فراز کے اس دل دوز کھیل نے جنّت نشاں کے اپنوں کو ان سے چھین کر انہیں پہاڑوں کے درمیان قید کر دیا تھا۔ جہاں دور پہاڑوں کی دوسری جانب سے اسے اپنے خون کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ لیکن اس کا خون جنّت نشاں کو دیکھنے کی خواہش میں اور ان سے ملنے کی کوشش میں پہاڑوں پر چڑھتے اور دوسری جانب اترنے کی کوشش کرتے، لیکن اس سے پہلے کہ جنّت نشاں پہنچ کر اپنے خون سے خون کا رشتہ جوڑتے پورب پچھّم، اُتّر، دکھن کی سرحدوں پر تعینات ان کے فوجی اسے گولیوں سے بھون دیتے اس ڈر سے کہ وہاں جا کر وہ ان کے راز فاش کر دیں گے۔

اب روبرو ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ خط بھی سینسر ہو کر مہینوں میں پہنچتے۔ فون پر بات بھی کئی دن کی محنت و مشقّت کے بعد جب ڈائل کرتے کرتے انگلیاں تھک جاتیں تو ٹیلی فون افسر کو رحم آ جاتا اور وہ دو چار منٹ کے لئے گفتگو کے تار کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتا۔

باتوں کا سلسلہ کچھ یوں شروع ہوتا......

''میں فرزندِ جنّت نشاں بول رہا ہوں۔''

'' بیٹے اتنے دن تم کہاں تھے۔؟ کہو کیسے ہو۔؟ اور تمہارے بھائیوں کا کیا حال ہے۔؟ تمہیں دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی ہیں اور اب تو آنکھوں کی روشنی بھی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ شاید کبھی تم سامنے آ جاؤ تو میں تمہیں پہچان بھی نہیں پاؤں۔ تمہاری امّی تمہارے انتظار میں روتی رہتی ہیں، اس امید پر کہ شاید اوپر والے کو رحم آ جائے اور سرحدوں

کے راستے کھول دے۔ ملنے کی کوئی سبیل نکل آئے۔''

''ابّو جان فرزندِ جنّت نشاں کا حال مت پوچھئے تو اچّھا ہے۔ ہر روز یہاں کے حاکم ہمارے لہو سے ظلم وستم کے باب لکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو سنا کر خوش ہوتے ہیں.....آج بھی ہمارے اندر عزم کا اتنا لہو ہے کہ سرحدوں کے پتّوں پر اپنی جیت کی کہانی لکھ سکتے ہیں۔ کئی بار ہم نے سرحد پار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پکڑے گئے اور برسوں جیل میں سڑتے رہے۔ چھوٹا بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ایک بار وہ میرے ساتھ سرحد پار کر رہا تھا۔ گولی نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ اب اس کا انتظار نہ کریں۔ کوئی اچّھا سالڑکا دیکھ کر لاڈلی کی شادی کردیں۔ اپنا اور امّی کا خیال رکھیں۔ خدا حافظ۔''

اس کے بعد برسوں ٹیلی فون آپریٹر کا عتاب جاری رہا۔ دونوں نے بہت کوشش کی۔ گفتگو نہیں ہو پائی۔ پھر نہ جانے ایک دن کیسے پوسٹ ماسٹر کو جنّت نشاں پہ رحم آگیا۔ اور اس نے اس کے باپ کا درد بھرا خط اسے ڈلیور کردیا۔

تحریری گفتگو کی یہ کڑی ٹیلی فونک گفتگو سے زنجیر کی طرح جُڑی ہوئی تھی۔

''بیٹے! تمہاری بہن رخصتی کے وقت تمہارا نام لے کر خوب روتی تھی کہ بھیّا نہیں آئے۔ دانت پر دانت لگ رہا تھا اسے۔ کسی طرح رخصتی ہوئی ......تمہاری ماں تمہارے غم میں پاگل ہوئی پڑی ہے۔ یہاں اس نے تمہاری شادی کردی ہے۔ ایک لڑکی کو بہو بنا کر گھر لے آئی ہے۔ کہتی ہے کہ وہ اپنی ماں سے روٹھا ہوا ہے۔ لیکن دلہن کے منانے پر وہ ایک دن ضرور لوٹ آئے گا۔''

اس خط کے جواب میں فرزند جنّت نشاں نے جو خط لکھا اسے پوسٹ ماسٹر نے بغیر سینسر کے جنّت نشاں کی سرحد کے حوالے کردیا۔

خط میں لکھا تھا......

''ابّو جان! کیا کروں۔؟ سرحدوں کی بیڑیاں پاؤں میں ہیں۔ ہاتھ ہمارے قلم کردیئے گئے ہیں اور آنکھوں میں سیاہ چشمے لگے ہوئے ہیں ——میں بدقسمت ہوں کہ ایک بہن کو بھائی کا پیار نہیں دے سکا۔ وہ لڑکی جسے بہو بنا کر ماں گھر لائی ہے، میں جانتا ہوں

کہ وہ میری پسند سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔لیکن یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے خوشیوں کا تاج نہیں پہنا سکتا۔''

اس رحم دل پوسٹ ماسٹر کے تبادلے کے بعد ایک بھی خط ایک دوسرے کو موصول نہیں ہوا۔ برسوں ایک دوسرے کی تحریر کے لئے دونوں ترس گئے ۔لیکن ایک دن اچانک ایک نیا ٹیلی فون آپریٹر کیسے بوڑھے پر مہربان ہوگیا کہ اس نے اس کے دل کے تار کو اس بیٹے کے دل سے جوڑ دیا۔

''بیٹا تمہارا انتظار کرتے کرتے تمہاری ماں بھی اس دنیا سے چلی گئی۔ایک میں ہوں جو بے نور آنکھوں سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ بہو بھی تمہارے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے۔اس کی آنکھوں میں جو تصویریں بنتی ہیں اسے میری بے نور آنکھیں دیکھ لیتی ہیں میں چاہتا ہوں کہ اسے کہہ دوں کہ اس کا انتظار بے کار ہے۔ وہ شادی کر کے اپنا گھر بسا لے ۔لیکن ایسا کہنے سے پہلے وہ مجھے سمجھانے لگتی ہے کہ آپ فکر نہ کریں۔ساری سرحدیں ایک دن ختم ہو جائیں گی اور.....لیکن اس کے باوجود ایک ڈر ہمیشہ ستاتا رہتا ہے کہ جب کبھی آمنا سامنا ہوگا تو پتہ نہیں تم مجھے پہچان پاؤ گے کہ یا نہیں۔لیکن بیٹا اسے پہچاننے میں دیر مت کرنا ۔سرخ ساڑی میں وہ بہت بھلی لگتی ہے۔اس نے تمہاری ماں کی بہت خدمت کی ہے اور اب اس اندھے بوڑھے کا وہی آخری سہارا ہے....بیٹا میری آخری خواہش ہے کہ جب میری موت ہو تو تم مجھے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارنا تاکہ عالمِ ارواح میں مجھے چین کی نیند میسّر ہو سکے۔''

''نہیں ابّو جان ایسی باتیں نہیں کرتے۔میری عمر بھی آپ کو لگ جائے ——— آنکھوں کے بے نور ہونے سے دل کی روشنی کم نہیں ہوتی۔ پھر جسم تو اپنے جسم کی خوشبو کو دور سے پہچان لیتا ہے۔ بہو میرا انتظار نہ کرے۔لیکن جنّت نشاں سے کہہ دیں کہ اس کا فرزند ساری سرحدیں توڑ کر اس کے دیدار کے لئے ضرور آئے گا.....امّی کے گذر جانے کا بے حد افسوس ہے۔آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور میری فکر چھوڑ دیں۔''

زمین و آسمان کے وجود میں آنے سے لے کر اب تک رشتوں کے درمیان کئی

سرحدیں حائل ہوئیں، اور کئی خاندان کے افراد سرحدوں کے اس ظالمانہ کھیل میں فاتح قوم کی محکومی قبول کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ سرحدیں ایک سی نہیں ہوتیں ۔نئی کی بنیاد پڑتے ہی پرانی ٹوٹ جاتی ہیں۔ٹوٹنے اور بکھرنے کے اس عمل میں کئی گھر آباد ہوتے ہیں تو کئی گھر برباد.....لیکن کبھی کبھی کچھ سرحدیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں قدرت اپنی کرشمہ سازی سے ایک پل میں عالم وجود میں لے آتی ہے اور کبھی صفحۂ ہستی سے ایک لمحے میں مٹا دیتی ہے۔

عورت اور مرد کی بھی اپنی اپنی سرحدیں ہوتی ہیں۔ایک عورت بغیر مرد کو دیکھے اپنی ساس کی صحتِ خرابی میں ان کی دیکھ بھال کرتے ہوئے تیمارداری کی ساری سرحدیں ایک ایک کر کے پار کر جاتی ہے۔لیکن اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اپنی ساس کو موت کی سرحد میں داخل ہونے سے روک نہیں سکی۔پھر وہ خود سے زیادہ اپنے سسر کا خیال رکھنے لگی۔جن کی آنکھیں بیٹے کے انتظار میں وقت سے پہلے وقت کی نظر ہوگئی تھیں۔لیکن اس کے بعد بھی وہ خوش تھے کہ ان کی آنکھیں بے نور ہیں تو کیا ہوا؟ بہو کی آنکھوں سے وہ ساری دنیا کو دیکھ لیتا ہے۔

ایک دن وہ جب بہو کی آنکھوں میں اُتر کر دنیا کی رنگینیوں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ رہے تھے تو ان کی بے نور آنکھوں نے بہو کی آنکھوں میں سوچ کے سائے دیکھے۔ان سے رہا نہیں گیا۔آخر کار انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

''تمہاری آنکھیں کیا سوچ رہی ہیں.....؟''

''یہی بابا کہ خالقِ کائنات نے اس سرزمین کو اتنا خوبصورت کیوں بنایا....؟ نہ یہ سرزمین دلہن کی طرح خوبصورت ہوتی اور نہ ہی چاروں طرف کے ممالک اسے اپنے میں ضم کرنے کے ناپاک ارادے رکھتے ...... ہمارے نوجوان جنّت نشاں کی بقا کے لئے کب تک قربانیاں دیں گے۔؟ جسم کی یہ کھیتی کبھی تو ختم ہوگی۔پھر کیا ہوگا۔؟ عورتوں کو ہی مورچہ

سنبھالنا ہوگا۔‘‘

بہو کی سوچتی ہوئی آنکھیں بوڑھے کی بے نور آنکھوں پر آ کر ٹھہر گئیں۔تب بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضدّی بچّے کی طرح کھیلنے لگی۔

’’ایک بھی مرد اگر زندہ رہا تب بھی وہ جنّت نشاں کی حفاظت کے لئے دشمن سے لڑے گا۔تمہیں مورچہ سنبھالنے کی ضرورت نہیں ہے۔میں ابھی زندہ ہوں۔میری آنکھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔؟تمہاری آنکھوں سے ایک ایک دشمن کو دیکھوں گا اور اس کا سینہ چھلنی کرتے ہوئے سرحدوں کے پار چلا جاؤں گا۔تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ ‘‘بوڑھے نے اپنی بےنور آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

’’چلنے کو تو میں بھی چلی چلوں گی ۔لیکن کہیں اس نے مجھے ناپسند کر دیا تو.....پھر میں کیا کروں گی۔؟‘‘اس کی آنکھیں سوچنے لگی تھیں۔

’’وہ اپنی ماں کی پسند کو ناپسند کر دے،ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ ‘‘بوڑھے نے پورے یقین سے کہا۔

’’جی آپ کہتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔لیکن پہلے یہ تو بتائیں کہ ہم لوگ چلیں گے کب....؟‘‘

بوڑھے نے کہنے کو تو جوش میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔لیکن جب کب چلیں گے بتانے کی باری آئی تو وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

’’اچّھا یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔لگتا ہے رات کافی ہو چکی ہے۔اب تم اپنے کمرے میں جاؤ اور آرام کرو۔بہت دبا چکی پاؤں۔‘‘

پھر وہ اپنی سوچ آنکھیں لئے وہاں سے سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بوڑھے بابا نے ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ایک بار پھر اپنی گرتی صحت کو چارپائی پر گرا دی ـــــ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہے تھے۔پھر انہوں نے سامنے رکھے ہوئے ریڈیو کو اِسٹارٹ کیا اور بے دلی سے خبریں سننے لگے۔

اس دوران بار بار ان کی بے نور آنکھوں میں ایک جھما کا سا ہوتا اور بیٹے کی تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ۔ ایسے وقت میں وہ ہر بار خالی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتے اور اوپر والے سے دُعا کرتے ۔''اے زمین وآسمان کے مالک! ساری سرحدیں ایک کر دے تا کہ انسانی رشتے جو الگ الگ سرحدوں میں قید ہیں، انہیں رہائی مل جائے، اور انسان جب حیوان کے سامنے جائے تو اسے پشیمانی نہ اُٹھانی پڑے۔''

ابھی بوڑھے نے اتنا ہی کہا تھا کہ چار پائی ہلنے لگی ۔ پھر بہو کے چلاّنے کی آواز آئی ـــــ''بابا! آپ ریڈیو سننے میں مگن ہیں جلدی باہر نکلیں ۔لگتا ہے کہ.....'' یہ کہتے ہوئے وہ چار پائی تک پہنچ گئی ۔ ہاتھ پکڑ کر بابا کو اُٹھاتے ہوئے ابھی باہری دروازے کی طرف دوڑنے ہی والی تھی کہ یکا یک زوردار آواز کے ساتھ لکڑی کے ستونوں پر ٹکی چھت اس کے سر پر چلی آئی.....اس کے بعد کیا ہوا۔؟ اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔

جنّت نشاں میں جہاں دنیا کی ساری خوبصورتی موجود تھی وہاں اب جہاں تک نگاہ جائے کھنڈر ہی کھنڈر اپنی قسمت پر روتے نظر آرہے تھے ۔ ملبے میں انسانی زندگی چیخ چیخ کر موت کی نیند سو چکی تھی ۔ کچھ کو تو چیخنے کا موقع ہی نہیں ملا ۔ ہر طرف ہاہا کار مچا ہوا تھا ۔ بہت کم زندگی ایسی تھی جو موت کے منہ سے نکل بھا گی تھی ۔لیکن جو بچ گئے تھے ان کی زندگی تو موت سے بھی بدتر تھی ۔ میدانوں میں زندگی بھوک پیاس سے کراہ رہی تھی ۔ ہسپتال کا تو نام ونشان باقی نہیں رہا تھا، ڈاکٹر تک کو زلزلے نے نگل لیا تھا تو پھر کراہتی زندگی کو زندگی کون دیتا ۔؟ بغیر دوا کے لاکھوں لوگ دم توڑتے رہے ۔کوئی پانی تک دینے والا نہیں تھا۔

چوبیس گھنٹے کے اندر دنیا بھر کی امدادی تنظیمیں ضروری اشیاء لے کر ہیلی کا پٹر سے وہاں پہنچیں ۔ چاروں طرف سرحدوں پر تعینات وہ فوجی بھی جو جنّت نشان پر ظلم ڈھا رہے تھے، وہ بھی انسانیت کا پرچم لہراتے ہوئے وہاں پہنچ گئے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا ۔ سب کے سب کراہتی زندگی کو ایک نئی زندگی دینے کی تگ ودو میں

لگ گئے۔ یہاں تک کہ کچھ نے اپنی جان کی بازی بھی لگا دی۔

ملبے سے انسان نکالے جا رہے تھے۔ لاشوں کو ٹرک سے دور دراز علاقوں میں پہنچایا جا رہا تھا۔ جہاں بڑے بڑے گڈھے کھود کر اسے دفن کرنے کا کام جاری تھا۔ اور جس میں زندگی کی تھوڑی بہت بھی رمق باقی تھی، اسے بچانے میں دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹر لگے ہوئے تھے۔

امدادی تنظیموں میں سے ایک تنظیم زندگی کی تلاش میں تیسرے دن بوڑھے کے گھر کے قریب سے گذری۔ ریڈیو اب بھی آن تھا اور خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ امدادی تنظیم کو زندگی کی مہک ملتے ہی وہ فوراً ملبہ ہٹانے میں جُٹ گئی۔ جیسے ہی چھت کی ٹین کو کاٹ کر روشن دان کے برابر گھسنے کے لئے جگہ بنائی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا لکڑی کے کھمبوں کے درمیان پھنسے بوڑھے کے پژمردہ جسم کو چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پہلے اسکے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور پھر وہ جیسے دھیرے دھیرے ہوش میں آنے لگے۔ لوگوں نے اندر جھانک کر دیکھا تو بوڑھے سے کچھ فاصلے پر ایک عورت مردہ حالت میں پڑی نظر آئی۔

امدادی تنظیم کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ لکڑی، ٹین، اینٹ اور دوسری گھریلو اشیاء کو ہٹا کر وہ سب جلد سے جلد اسے باہر نکال لینا چاہتے تھے۔ اس وقت بوڑھے کے جسم میں تھوڑی تھوڑی حرکت بھی ہونے لگی تھی۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن بلیوں کے درمیان اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ اُٹھ پانا ان کے لئے مشکل تھا۔ ریڈیو اب بھی بج رہا تھا اور اس تباہی سے متعلّق خبریں نشر ہو رہی تھیں۔

''اب تک کے سب سے برے زلزلے نے جنّت نشاں کو پوری طرح سے کھنڈر میں بدل دیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق مرنے والوں کی تعداد کئی لاکھوں میں ہو سکتی ہے۔ دنیا کی تمام امدادی تنظیمیں وہاں پہنچ چکی ہیں۔ راحت کا کام زور و شور سے جاری ہے .....اور وہ تمام لوگ جو اپنے رشتہ داروں کی تلاش میں وہاں جانا چاہتے ہیں، ان کے لئے سرحدیں فوری طور پر کھول دی گئی ہیں، اور وہ اب بغیر کسی روک ٹوک کے جنّت نشاں جا سکتے ہیں۔

بوڑھے کی سماعت سے جیسے ہی یہ خبریں ٹکرائیں، یکا یک ان کے پژمردہ جسم میں جیسے جان سی آ گئی۔ بے نور آنکھوں میں بیٹا کا چہرہ گھوم گیا۔ انہوں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے اُٹھنے سے پہلے ہی امدادی تنظیم کے اراکین سے آگے بڑھ کر ایک نے انہیں اپنی گود میں بھر لیا۔ جسم سے جسم کی خوشبو ٹکرائی اور بوڑھے کے چہرے کی شاخوں پر مسکراہٹ کی ننھی ننھی کلیاں کھل اُٹھیں۔

''بیٹا___!''

''ہاں میں آ گیا ہوں۔ اب آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔'' پھر ڈاکٹر سے گڑگڑاتے ہوئے۔ ''ڈاکٹر صاحب میرے بابا کو بچالو۔''

یکا یک بوڑھے کو کچھ یاد آیا۔ انہوں نے بیٹے سے کہا___''بہو میرے ساتھ تھی۔ ذرا دیکھو اسے کہ وہ کس حال میں ہے....؟''

تبھی امدادی تنظیم میں سے ایک نے سرخ ساڑی میں ملبوس ایک عورت کو اس کے سامنے اِسٹریچر پر لا کر لٹا دیا۔ کسی نے کہا ___''اس کی بھی سانسیں چل رہی ہیں۔''

اتنا سنتے ہی بوڑھے نے کہا ___''بیٹا مجھے چھوڑ اور اسے ہسپتال لے جا....اسے اس وقت تیری ضرورت ہے۔''

اس کے بعد بوڑھے نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے اپنے ہاتھ دُعا کے لئے جوڑے اور اپنی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا دیں۔

''اے زمین و آسمان کے مالک! جب جب سرحدیں رشتوں کے درمیان حائل ہو جائیں تب تب زمینی نشیب و فراز کا یہ کھیل اسی طرح جاری رکھنا تا کہ بچھڑے اپنوں سے مل سکیں۔''

دُعا ختم ہوتے ہی بابا کا سر بیٹے کی گود میں ایک طرف ڈھلک گیا۔

☆

چھڑی

ابھی ابھی پوسٹ مین پرنسپل چیمبر سے باہر نکلا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بریک ہوگئی۔ سارے ٹیچر اسٹاف روم میں جمع ہو گئے۔ سب کو چائے کا انتظار تھا کہ تبھی چپراسی اندر آیا اور بولا۔ ''پرنسپل سر نے کہا ہے کہ آج آپ سب چائے ان کے ساتھ چیمبر میں پئیں۔ شاید کوئی میٹنگ وٹنگ ہو۔''

سارا اسٹاف جب کرسیوں پر بیٹھ گیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا تب پرنسپل صاحب نے آنکھوں سے گولڈن فریم کے چشمے کو الگ کیا۔ ایک دو بار ہاتھوں سے اسے گھمایا۔ پھر سامنے رکھے ہوئے اس لیٹر کو جس کے لئے آناً فاناً میں یہ میٹنگ بلائی گئی تھی، اسے سینئر موسٹ ٹیچر، پی جی ٹی فزکس، کے کے یادو کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا دیا۔

'ایجوکیشن منسٹر کی طرف سے یہ لیٹر آیا ہے۔ اسے اچھی طرح پہلے آپ پڑھ لیں اس کے بعد سب سے سائن کروالیں۔''

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ دھیرے سے مسکرائے اور پھر کے کے یادو سے پوچھا ــــ ''ہاں تو آپ نے لیٹر پڑھ لیا۔؟''

''جی ــــ جی سر ــــ''

پھر ایک ساتھ دونوں کی نظریں ڈاکٹر صدّیقی، پی جی ٹی میتھ کی طرف اُٹھ گئیں۔

اُس وقت ڈاکٹر صدّیقی پرنسپل کی طرف دیکھ رہے تھے اور عادت کے مطابق چھڑی کو آہستہ آہستہ گھُماتے بھی جارہے تھے۔ اُنہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُن کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں۔ ؟ چہرے پر تیکھی مسکراہٹ کیوں ہے۔؟

''کیا بات ہے سر ـــــ ؟'' ڈاکٹر صدّیقی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

اس سے پہلے کہ پرنسپل صاحب کچھ کہتے ۔ سینئر موسٹ نے اپنی بات شروع کر دی۔

''سر اِس سے ہم جیسے ٹیچروں کا کیا لینا دینا۔؟ آپ صرف ڈاکٹر صدّیقی کو یہ لیٹر پڑھوا دیتے۔ بس میٹنگ ہو جاتی۔ بعد میں سبھی سائن کر لیتے.....'' پھر ڈاکٹر صدّیقی کو چھیڑنے کے انداز میں ـــــ ''ڈاکٹر صاحب آپ کی چھڑی گرنے والی ہے۔ ذرا زور سے پکڑ کر رکھئے۔ ورنہ ....؟'' کے کے یادو کے چہرے پر ایک بار پھر تیکھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے پرنسپل صاحب سے بولے۔ ''سوری سر ـــــ ! ہم لوگوں میں اس طرح کا مذاق چلتا رہتا ہے۔ آپ بُرا نہ مانیں۔ میٹنگ شروع کریں۔''

''پر یہ گُروجنو ـــــ !''

'' نیو ایجوکیشن سسٹم کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر ایجوکیشن منسٹر نے تمام اسکولوں کو یہ لیٹر سرکولیٹ کیا ہے کہ ہم اسکول میں کسی بھی بچّے کو کسی بھی وجہ سے کسی بھی طرح کا پنشمنٹ نہیں دے سکتے۔ اگر دیتے ہیں تو غلط کرتے ہیں۔ اِس غلطی کے نتیجے میں ہمیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔'' تھوڑا رک کر۔ '' آپ سب ہائلی کوالیفائیڈ ہیں۔ زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس میری آپ سبھوں سے اتنی گزارش ہے کہ اس لیٹر کو ٹھیک سے پڑھ لیں اور اس پر عمل کریں۔''

''سر ہم لوگ تو عمل کرتے ہی ہیں، لیکن بے چارے صدّیقی صاحب، جن کا پہلا پیار چھڑی ہے۔ کیا وہ اپنی اس جان کو خود سے الگ کر پائیں گے ـــ ؟'' محمّد علی کوثر، ٹی جی ٹی اُردو نے شگوفہ چھوڑا۔

ٹیچروں کے ہنسنے کی ملی جلی آواز چیمبر کے کونے کونے میں پھیل گئی ـــــ

''دیکھئے میرا کام تھا بتانا ..... اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرے تو میں تو یہی سمجھوں گا کہ اُنہیں اپنی نوکری سے پیار نہیں ہے۔'' پرنسپل صاحب کے طنز بھرے جملے ڈاکٹر صدّیقی کے کانوں سے جیسے ہی ٹکرائے، اُن کی آنکھوں کے سامنے بیمار بیوی اور دو جوان بیٹیوں کا خوبصورت چہرہ گھوم گیا۔ وہ اندر ہی اندر تھرّا کر رہ گئے۔ چھڑی اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔

''ڈاکٹر صاحب گری ہوئی چھڑی نہیں اٹھاتے ـــــ'' ایک نے کہا۔

''ارے بھئی اُٹھانے دو۔ کتنوں کا بھلا کیا ہے اِس چھڑی نے ـــــ'' دوسرے نے اپنے بغل والے کو کہنی ماری تو اُس نے بھی اِس موقعے کو اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دیا۔

''ڈاکٹر صدیقی کی جگہ اگر ان کی یہ چھڑی کلاس میں پہنچ جائے تو بھی بچّے میتھ میں پاس ہو جائیں گے۔''

اتنے طنز بھرے تیروں کے بعد بھی جب ڈاکٹر صدّیقی کے ہاتھ زخمی نہیں ہوئے۔ اور اُنہوں نے جھک کر چھڑی اُٹھالی تو پرنسپل صاحب سے رہا نہیں گیا۔

''ڈاکٹر صدّیقی ! زمانہ بدل گیا ہے۔ شکچھا کا اَستر بدل گیا ہے۔ ہم چاہ کر بھی کسی کو پڑھا نہیں سکتے ہیں۔ جسے پڑھنا ہوگا وہ خود پڑھے گا۔ اور جس نے لاٹھی کے زور پر چھاتروں کو پڑھانے کی کوشش کی۔ اِس کا مطلب ہے کہ اُس کے پاس ٹیلنٹ نہیں ہے۔ ڈر چھڑی میں نہیں، شکچھک کی آنکھوں میں ہونا چاہئے..... ایسے ہم سب جانتے ہیں کہ آپ ایک بہترین ٹیچر ہیں۔ آپ سے پہلے اِس اسکول میں میتھ کی حالت بہت اچھّی نہیں تھی۔ آج آپ نے بچّوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آپ کے اندر میتھ کو لے کر جو دیوانگی ہے، جو پاگل پن ہے، اس کا اعتراف تو اِسٹوڈنٹس اور پیرینٹس بھی کرتے ہیں...... لیکن یہ سب اس وقت تک ہے جب تک سب ٹھیک ہے۔ جس دن کوئی انہونی ہو گئی۔ اس دن سب کچھ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ کیا ہوا تھا: نرسری میں پڑھانے والی اس لیڈی ٹیچر کا...؟ اس نے بس اتنا ہی تو کیا تھا کہ اے بی سی ڈی یاد نہیں کرنے والی لڑکی کو کلاس کے باہر برآمدے میں کان پکڑ کر کھڑا کروا دیا تھا۔ دھوپ بہانہ بنی اور وہ لڑکی مر

گئی ــــ اس وقت نہ کسی ٹیچر نے اس کا ساتھ دیا۔ نہ ہی منجمنٹ نے۔ میڈیا نے تو اس معاملے کو ایسا اُچھالا کہ وہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بہترین ٹیچر تھی۔ لیکن آج جیل میں ہے۔'' چشمہ صاف کرتے ہوئے ایک نظر انہوں نے تمام ٹیچرس پر ڈالی۔ پھر آگے کہا۔'' ساتھیو! میں نہیں چاہوں گا کہ آپ میں سے کوئی جیل جائے اور اسکول بدنام ہو۔''

ڈاکٹر صدّیقی کے دماغ کی نسیں پوری طرح سے چھڑی کے چاروں طرف اُلجھی ہوئی تھیں ــــ بریک ختم ہوئی۔ میٹنگ ختم ہوئی۔ لیکن بات ختم نہیں ہوئی۔ وہ لیزر پیریڈ انجوائے کرنے والے ٹیچروں کے ساتھ پاؤں پاؤں چلتی ہوئی اِسٹاف روم تک آ گئی۔

''اِس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ ہوم ورک نہیں بنائے، ڈسپلین خراب کرے، ٹیچر کو آنکھ دکھائے، اسٹرائیک کرے۔ تب بھی کچھ نہیں کرنا ہے.....؟ ''ایک ٹیچر جو پہلے مذاق کے موڈ میں تھا۔ اب سریس نظر آنے لگا تھا۔

''یار اب تو گارجین اور سر چڑھ جائیں گے۔ اُس دن آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ گارجین ایک نمبر بڑھوانے کے لئے کیسے اُلٹے سیدھے سوال کر رہا تھا۔ ''ایک اور ٹیچر کے منہ کا ذائقہ اِسٹاف روم تک آتے آتے بدل گیا تھا۔

ڈاکٹر صدّیقی یوں تو خاموش بیٹھے تھے۔ لیکن مِس گیتا نجلی، ٹی جی ٹی سائنس نے بھانپ لیا تھا کہ ان کے دماغ کی ہانڈی میں جملے اُبال مار رہے ہیں۔ اُنہوں نے فوراً سوال کی ایک موٹی لکڑی بھٹّی میں ڈال دی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے صدّیقی سر کہ آج کے ایجوکیشنسٹ پنشمنٹ کو لے کر جو اس طرح کی وکالت کر رہے ہیں، وہ درست ہے۔ یا پھر اس کے پیچھے بھی کچھ نہ کچھ راز ہے.....؟'' وہ بولتے بولتے رک جاتی ہے۔ ڈاکٹر صدّیقی کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔

کچھ دیر تک ڈاکٹر صدیقی اسی طرح خاموش رہتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں۔

''دیکھئے میڈم ــــ!'' وہ چھڑی کو دھیرے دھیرے گھمانے لگتے ہیں۔'' اصل میں آج ایجوکیشن، ایجوکیشنسٹ کے پاس نہیں، پیسہ والوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو آج ایک کاروبار کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جہاں ڈگریاں خریدی اور بیچی جاتی ہیں ...... اگر دکان

دار اپنے گاہک کے ساتھ اچھے سے پیش نہیں آئے تو دکان داری چوپٹ سمجھو۔ تعلیم کے سوداگروں نے اپنی دکان کو چمکانے کے لئے اِدھر فیل پاس کے سسٹم کو ہی ختم کر دیا ہے۔ پرانے زمانے میں جب مٹھ اور گُرو کُل سسٹم ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت گُرو بھگوان کے بعد سب کچھ ہوتا تھا۔ ششیہ ایک اشارے پر انگوٹھا قربان کر دیتا تھا۔ لیکن آج ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کسی بھی گارجین سے پوچھ لیجئے کہ آپ بچّے کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔ وہ آئی اے ایس، سائنٹسٹ، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل یہاں تک کہ کلرک بنانے کی بات کریں گے۔ لیکن کوئی ٹیچر کی بات نہیں کرے گا۔ یہ وقت کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ نہیں کر پاتا ہے، وہی ریجیکٹیڈ لاٹ آخر میں ٹیچر بن جاتا ہے۔ یہی آج کی تعلیم کا سب سے بڑا المیہ ہے۔''

ڈاکٹر صدّیقی اب بھی چھڑی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور اندر ہی اندر پریشان ہو رہے تھے کہ وہ چھڑی جو برسوں سے ان کی روح میں سمائی ہوئی ہے۔ اُسے خود سے الگ کرنا پڑے گا—— ایجوکیشن منسٹر سے نافرمانی کا مطلب اپنے آپ کو نوکری سے دست بردار کرنا تھا۔ اچانک ان کے اندر ایک طرح کی بے چینی شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ کچھ اور مضطرب ہوتے۔ مذاق کا نشانہ بنتے....وہ اپنے قدموں پر تھکے جسم کو سوار کئے الماری کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ سبھی خاموشی سے اس وقت انہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے کرب کو محسوس کرتے ہیں......
جب ڈاکٹر صدّیقی ناتواں ہاتھوں سے الماری کھولتے ہیں۔ کاپی اور فائلوں کی بھیڑ میں چھڑی کو چھپا کر اسٹاف روم سے نکل رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ان کی ریڑھ کی ہڈّی ہی نہ ہو۔ جیسے اس کی جگہ چھڑی رہتی ہو۔ اس چھڑی کو تو اُنہوں نے اپنے وجود سے نکال کر الماری میں رکھ دیا تھا۔ اِس لئے اُس وقت ان کی کمر آگے سے فطری طور پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر صدّیقی کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا۔ وہ پی ایچ ڈی اور نیٹ بھی تھے۔ لیکن اِس خوف سے کہ اگر اُنہوں نے کالج کا رُخ کیا تو چھڑی کے ساتھ ان کی جو دیرینہ

رفاقت ہے اُس کا قتل ہو جائے گا۔ دوست احباب نے بھی کئی بار سمجھانے کی کوشش کی۔

''صدّیقی تم اپنے ٹیلنٹ کو دھوکہ دے رہے ہو۔ بس قدم بڑھانے کی دیر ہے۔ پھر دیکھنا یونیورسٹی کیسے تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔''

اور وہ ہمیشہ مسکرا کر دوستوں کی باتوں کا یوں جواب دیتے ......

''میں خوبصورت عمارت نہیں، اس کی بنیاد بننا چاہتا ہوں تا کہ اندر سے مضبوطی دے سکوں۔''

ڈاکٹر صدّیقی کے ساتھ چھڑی کا رشتہ بہت پرانا تھا۔ ان دنوں وہ پرائمری اسکول میں ہوا کرتے تھے۔ داؤد عالم ان کے کلاس ٹیچر تھے۔ ان کی چھڑی کا خوف لڑکوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ سکتے تھے، لیکن میتھ کا ہوم ورک وہ نیند کی حالت میں بھی کرنا نہیں بھولتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صدّیقی نے اسکول جوائن کیا تو پہلے ہی دن اور وہ بھی پہلی ہی گھنٹی میں چھڑی دانستہ ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ایک لڑکے کو چھڑی کیا ماری کہ اس کی گونج پورے اسکول میں بیک وقت سُنی گئی۔ پھر کیا تھا: دھاک جم گئی اور چھڑی انکے ٹیچنگ اِسٹائل کا حصّہ بن گئی۔

وہ چھڑی کے ساتھ گرین کلر کی ڈائری بھی رکھا کرتے تھے۔ جس کے اندر گرین کلر کا پین ہوا کرتا تھا۔ جس میں روشنائی بھی گرین کلر کی ہوا کرتی تھی ـــــ وہ جسے مارتے تھے جم کر مارتے تھے۔ اور پھر اس کا نام اس میں درج کر لیتے تھے۔ کلیگ کے پوچھنے پر وہ فخر سے کہتے۔

''جس کا نام اس گرین ڈائری میں ایک بار گرین روشنائی سے اِنٹر ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ اسی دن سے وہ گرین پین رکھنے کا اہل ہو گیا۔''

چھڑی اور ڈائری کو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چھٹّی کے دنوں میں گھر لے آتے۔ ایک ایک صفحہ کو غور سے پڑھتے۔ کس کو کتنی چھڑی مار پڑی تھی اور کس لئے..... یہاں تک کہ وقت، تاریخ، کلاس اور گھنٹی کے ساتھ ساتھ فیملی بیک گراؤنڈ بھی درج ہوتا۔ جب وہ کسی کو مارتے تو ان کے چہرے پر نہ کسی طرح کا تناؤ ہوتا اور نہ ہی غصّہ دیکھنے کو

ملتا۔ بلکہ ایک طرح کا سکون ہوتا۔ اکثر کلیگ ان کی ان حرکتوں سے چڑھ جاتے۔ اُوٹ پٹانگ باتیں کرتے۔

''ڈاکٹر صاحب! صرف آپ کی وجہ سے میرے سبجیکٹ کا ریزلٹ خراب ہوا ہے ..... چھڑی نے بچّوں کے اندر ایسی دہشت پیدا کر رکھی ہے کہ بچّے سوتے جاگتے صرف میتھ کی ہی بات کرتے ہیں۔''

کلیگ کی ایسی بچکانہ باتوں پر جب بھی ڈاکٹر صدیقی کو غصّہ آتا وہ میتھ کی نئی گلوبل بھاشا میں انہیں سمجھانے کی یوں کوشش کرتے۔

''دیکھو بھئی! آج دنیا ایک بازار ہے اور بازار میتھ کی بیساکھی پر چلتی ہے۔ ایک جاہل بھی سامان کی خرید و فروخت اور روپئے پیسے کے لین دین میں ہوشیاری دکھاتا ہے...... ایسے میں کل ان بچّوں کو صرف اپنے ملک کا حساب کتاب نہیں کرنا ہے، بلکہ ساری دنیا کا حساب بھی رکھنا ہے۔ اس لئے وہ میتھ میں زیادہ وقت تو دیں گے ہی۔''

اپنے تیس سالہ سروس میں وہ پندرہ سال چھڑی کے ساتھ اسکول گئے۔ لیکن آخری کے پندرہ سالوں میں..... حالانکہ اس دوران بھی وہ ہر روز پریئر کے بعد رجسٹر یا فائل کے بہانے الماری کے اندر ہی چھڑی کو چھو لیتے تھے۔ ڈائری پر چُھپ چُھپا کر نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ جب تک ایسا نہیں کرتے انہیں سکون نہیں ملتا تھا۔

سروس کے ابتدائی پندرہ سالوں میں ان کی جادوئی چھڑی کا ہی یہ کمال تھا کہ اُن کے زیادہ تر طلباء اونچے عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ ان میں سے جب بھی کوئی اسکول آتا تو اُن سے ضرور ملتا۔۔۔۔۔ ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا تھا۔ وہ گھر پر ہی تھے۔ ایک لڑکا جس نے اسی سال آئی اے ایس کمپلیٹ کیا تھا۔ وہ ان سے ملنے کے لئے اسکول پہنچا ۔ وہاں سے وہ گھر آیا۔ کال بیل کی گھنٹی بجتے ہی ڈاکٹر صدّیقی دیوار کے سہارے دروازے تک پہنچے۔

''کون ہو بھئی ؟''

''آنے والے نے پہلے پیر چُھوا۔ پھر کہا۔

''میں ـــــ میں سر ـــــ پرشوتّم ـــــ''

''کون پرُشوتّم ـــــ ؟'' دماغ پر زور ڈالتے ہوئے۔ ''ارے کہیں وہ تو نہیں جس کے فادر ایئرفورس میں تھے اور دوسروں کے بہکانے پر مجھ پر کیس کرنے جارہے تھے۔؟''

''جی ـــــ جی ہاں ـــــ'' لڑکے نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''ارے تو بولو نہ کہ میں پرشوتّم اوستھی ہوں۔''

پھر وہ دروازے کی طرف مڑ گئے ـــــ آؤ آؤ ـــــ ذرا دیکھ کر آنا۔'' انداز سے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے۔'' دیکھو سامنے کرسی ہوگی۔ اس پر بیٹھ جاؤ۔'' کرسی پر بیٹھتے ہی پرُشوتّم اوستھی نے پہلے اپنے انگوٹھے کو دیکھا۔ پھر کہا۔

''سر مجھے اب بھی وہ مار یاد ہے۔ میرا ٹوٹا ہوا انگوٹھا اکثر آپ کی چھڑی کی یاد دلاتا ہے۔ کتنا مارا تھا آپ نے مجھے سر.....لیکن آج سوچتا ہوں کہ اگر اس دن آپ کی مار نہیں پڑی ہوتی تو میں خواب میں بھی آئی اے ایس نہیں کر سکتا تھا۔''

پرُشوتّم اوستھی جیسے ہی خاموش ہوئے۔ صدّیقی جی بولے۔

''دیکھو سامنے ٹیبل پر ڈائری ہوگی۔''

''جی ـــــ جی سر ـــــ ارے یہ تو وہی ڈائری ہے جسے آپ کلاس میں لے کر آتے تھے۔'' پرُشوتّم اوستھی نے اس گرین کلر کی ڈائری کو پہچان لیا تھا۔

''اس کے پیج نمبر ۷۷ا میں دیکھو کیا لکھا ہے۔؟''

''پرُشوتّم اوستھی ''

''اس کے آگے دیکھو برائیکیٹ میں کچھ لکھا ہوا ہوگا۔؟''

''آئی اے ایس۔''

ڈاکٹر صدّیقی کے ریٹائرمنٹ کا وقت جیسے جیسے قریب آرہا تھا، ویسے ویسے ان کے دل کی دھڑکنیں بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ انہوں نے شروعات کے پندرہ سالوں میں ۳۶۵ صفحات والی ڈائری میں ۷۷ا لڑکوں کے نام لکھے تھے۔ درس و تدریس کے اس سہانے سفر میں جب چھڑی اور ڈائری ان کے شانہ بہ شانہ چل رہی تھیں تو ہر وقت ان کے

چہرے پر ایک طرح کی طمانیت ہوتی۔ وہ جب بھی چھڑی کو دیکھتے تو ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل جاتی۔ اور جب بھی ڈائری کھولتے تو انہیں روح افزا ٹھنڈک پہنچتی۔ ان کا سینہ فخر سے پھولنے لگتا کہ انہوں نے ملک کو ایسے لعل و گوہر دئے ہیں جن کے ارادوں کے پنکھوں پر بیٹھ کر ایک نہ ایک دن ملک آسمان کی ساری اونچائیاں چھولے گا ـــــ لیکن ۷۷ ر صفحے کے بعد جیسے ہی وقت ان کے خلاف ہوا۔ ان کا قلم رک گیا۔ قلم کے اندر کی روشنائی سوکھ گئی۔ اب نہ تو وہ کسی کو مارتے تھے اور نہ ہی کوئی اس ڈائری کا حصّہ بنتا تھا۔ اکثر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ کل اور آج کے طالب علموں کا موازنہ کرتے۔

گارجین کا محاسبہ کرتے......اور یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتے کہ آخر اس دنیا کا کیا ہوگا۔؟

اِبتدائی زمانے میں انہیں اسکول کے ایک ایک بچّے کا نام، کون کہاں رہتا ہے۔؟ فیملی میں کتنے ممبر ہیں۔؟ والدین کیا کرتے ہیں۔؟ سوشل اِسٹیٹس کیا ہے۔؟ انہیں سب معلوم تھا۔ لیکن پھر ایجوکیشن سسٹم میں تبدیلی کیا آئی۔ نصاب کیا بدلے کہ وہ طالب علموں کے نام بھولنے لگے۔ اُنسیّت میں کمی آنے لگی ـــــ وہ جب بھی پرانی باتوں کو یاد کرتے اکثر ان کی آنکھیں بھیگ جایا کرتیں۔

ریٹائرمنٹ سے ایک سال قبل نئے فزیکل ٹیچر اور سینئر اِسٹوڈنٹس کے درمیان ڈِسپلین کو لے کر کہا سُنی ہوگئی تھی۔ لڑکوں نے ہنگامہ کر دیا۔ ایک نے پیچھے سے ان کے سر پر بیٹ سے وار کیا۔ ان کی وہیں موت ہوگئی۔ فزیکل ٹیچر، دلیر سنگھ کا خون سے لت پت چہرہ آج بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے ـــــ وہ لڑکا کچھ ہی دنوں کے بعد جیل سے چھوٹ گیا تھا۔ ایک منسٹر کی شہ پر اس لڑکے نے بعد میں اسی اسکول سے پلس ٹو کا امتحان بھی دیا۔

اِس حادثے کے بعد تو جیسے ڈاکٹر صدّیقی پر سانپ سونگھ گیا تھا۔ اب وہ چپ چاپ ڈرے سہمے سے کلاس روم میں اِن کرتے تھے۔ پڑھاتے اب بھی محنت سے تھے۔ لیکن اب وہ پہلے والی بات نہیں تھی۔ پہلے گھنٹی لگنے کے بعد جب تک سوال حل نہیں ہوجاتا تھا وہ نکلتے نہیں تھے۔ لیکن اب اُنہیں پہلے سے ہی گھنٹی کا انتظار رہتا۔ اور کبھی کبھی تو پانچ دس منٹ قبل ہی وہ بچّوں سے نظریں بچا کر کلاس روم سے نکل جایا کرتے۔

ڈر جب سے ان کی شریانوں میں پیوست ہوا تھا۔ وہ چاہنے لگے تھے کہ جلد سے جلد ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آجائے تاکہ وہ اس نوبل پروفیشن سے عزّت کے ساتھ سبکدوش ہوسکیں۔

پھر وہ دن آ ہی گیا ——

لیکن ریٹائرمنٹ سے ایک دن قبل پلس ٹو کے اسٹوڈنٹس نے ایک ہنگامی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں ہر حال میں صدّیقی سر کا فیئر ویل کرنا ہے۔ پرنسپل صاحب نے پہلے انکار کیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''سر سے بات کرلو۔ اگر وہ تیّار ہو گئے تو ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر صدّیقی کسی بھی قیمت پر ہاں کرنے والے نہیں تھے۔ لیکن جب دو چار ان ڈسپلین لڑکے بھی رکویسٹ کرنے لگے تو انکار کرنے کی ہمّت نہیں ہوئی۔

پرنسپل نے فیئر ویل کے سلسلے میں ایک میٹنگ بلائی ۔

''نہیں سر—— ہم سب بچّوں کے ساتھ مل کر فیئر ویل نہیں کریں گے۔ دس پندرہ سالوں میں کتنے ٹیچرس ریٹائر ہوئے۔ بچّوں کا پارٹی سیپیشن کبھی نہیں رہا..... ویسے پہلے کی بات کچھ اور تھی۔ وہ سب کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔ ڈاکٹر صدّیقی جانا چاہتے ہیں تو جائیں۔ لیکن ہم سب اسٹاف روم میں ہی فیئر ویل دیں گی۔ اس کے بعد سب ایک ساتھ لنچ لیں گے اور اسکول کی گاڑی سے ان کو چھوڑنے ان کے گھر تک جائیں گے ——'' اِسٹاف سکریٹری اکھلیش کمار پی جی ٹی انگریزی نے یہ بات کہی تو کئی ٹیچروں کے ساتھ سینئر موسٹ ٹیچر کے یادو نے بھی اس متفقہ فیصلے پر 'ہاں' کی مہر لگادی۔

فیئر ویل سے قبل کی رات ڈاکٹر صدّیقی عجب کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہ کبھی چھڑی کو ہاتھ میں لیتے، اُسے گھماتے کبھی اپنے سینے سے لگا کر پھپھک پڑتے —— ڈائری کے ایک ایک صفحہ کو اُلٹتے۔ طالب علموں کے نام پڑھتے۔ اُن کے مستقبل کے بارے میں کیا لکھا تھا اور وہ کیا بن پائے۔ اس کا محاسبہ کرتے............ ہر صفحہ کے الٹتے ہی ان کی آنکھوں کے کینوس پر ایک تصویر اُبھرتی۔ جس کا عکس ڈائری میں نظر آتا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اُسے چھونے کی کوشش کرتے۔ پھر ایک الگ ہی دنیا میں ڈوبتے چلے جاتے۔ اِس طرح ایک ایک کر کے وہ ۱۷۷ صفحات تک پہنچ گئے ۔ پُرشوتّم اوستھی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس

سے ملے دس سال ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کوئی ملنے نہیں آیا۔ کیوں ملنے نہیں آیا۔؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب وقت کے پیمبر کے پاس بھی نہیں تھا ـــــ اس کے بعد کا صفحہ خالی تھا۔ اس کے بعد پوری ڈائری خالی تھی۔ وہ خالی صفحے کو اُلٹتے جا رہے تھے۔ اور آنکھیں تھیں کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ بھیگتی ہی جا رہی تھیں۔ اُنہیں لگ رہا تھا کہ یہ تو اُن کی ہی غلطی ہے۔ جب ڈائری ان کے پاس تھی۔ قلم اُن کے ساتھ تھا۔ پھر ۳۶۵ رصفحات کی ڈائری کو بھرنے میں تیس سال کے شب و روز کم کیسے پڑ گئے۔؟ ۱۸۸ رصفحات خالی کیسے رہ گئے۔؟ اُنہیں لگا کہ یہ خالی صفحات اُن کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ڈرپوک، بُزدل کہہ کر اُن کا منہ چڑھا رہے ہیں۔

''نہیں میں بُزدل نہیں ہوں۔'' غُصّے میں اُنہوں نے چھڑی سے ڈائری پر ایک زوردار وار کیا۔ قلم سہم کر نیچے گر گیا۔ ڈائری کا ایک ورق بھی پھٹ گیا۔ اُس وقت وہ بچّے کی طرح پھپھک پھپھک کر رونے لگے تھے۔ پھر انہوں نے پھٹے ورق کو بڑے پیار سے اسی جگہ گوند سے چپکایا۔ قلم کے ایک ایک پُرزے کو گرم پانی سے صاف کیا۔ ہری روشنائی بھری۔ اسے ڈائری میں اسی جگہ رکھا۔ اور پھر سینے سے لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن نیند آج ان کی آنکھوں میں کہاں تھی۔ ؟ وہ ساری رات اندھیرے میں کبھی چھڑی کو اور کبھی ڈائری کو اپنے تیس سالہ سفر کی روداد سناتے ـــــ سناتے سناتے وہ رو پڑتے۔ بیوی نے انہیں بہت سمجھایا۔ بیٹیاں بیاہی جا چکی تھیں۔ رہتیں تو وہ بھی ماں کے ساتھ ساری رات جاگتیں۔

اِسٹاف روم میں ایک خاموش ہنگامہ تھا۔ فیئر ویل کی تیّاریاں چل رہی تھیں۔ کہیں میٹھائی رکھی ہوئی تھی۔ کہیں تحائف سجائے گئے تھے۔ ٹرے میں پھولوں کی مالا رکھی تھی۔ ٹیبل پر وہائٹ کلاتھ بچھا تھا۔ چپراسی کپ اور طشتری دھونے میں مشغول تھا ـــــ پرنسپل صاحب، سینئر موسٹ ٹیچر اور اِسٹاف سکریٹری سے تیّاریوں کے متعلّق فیڈ بیک لے چکے تھے اور مطمئین تھے۔ دوسری طرف پلس ٹو کے لڑکے کلاس روم کو سجانے میں لگے ہوئے تھے۔

آج ڈاکٹر صدّیقی اپنے پسندیدہ لباس سفید کُرتا پائجامہ میں اسکول پہنچے تھے۔

سب سے مل رہے تھے اور ایک آخری بار اسکول کے درو دیوار اور وہاں کے مناظر کو آنکھوں میں سمیٹ رہے تھے۔ آج انہیں اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ مخدوش حالات میں بھی انہوں نے ہمّت اور حوصلے سے کام لیا۔ جس کی وجہ سے آج وہ عزّت کے ساتھ سبکدوش ہو رہے ہیں۔

''عزّت ـــ؟'' کسی نے اندر ہی اندر طنزیہ سرگوشی کی۔ ''جسے تم عزّت سمجھ رہے ہو وہ دراصل تمہاری بُزدلی ہے ڈاکٹر صدّیقی۔ '' اسے اپنا ہمزاد سامنے نظر آیا۔

''نہیں میں بُزدل نہیں ہوں۔'' وہ چیخ رہے تھے۔ لیکن ان کی آواز حلق میں ہی اٹک کر رہ جا رہی تھی۔ وہ پسینے میں بھیگنے لگے تھے۔ پھر وہ تیزی سے الماری کے پاس پہنچے۔ دروازہ کھولا۔ چھڑی اور ڈائری کو دیر تک ہاتھوں میں لے کر دیکھتے رہے۔ وہ اب بھی چیخ رہے تھے۔ لیکن اس چیخ میں آواز کہاں تھی۔؟ اسٹاف روم میں موجود کلیگ نے اسے ریٹائرمنٹ کے غم سے جوڑ کر دیکھا۔ اس لئے کسی نے ان سے کچھ نہیں کہا ـــ پھر وہ کچھ دیر بعد سیدھے وہاں پہنچ گئے جہاں پلس ٹو کے طالب علم فیئر ویل کی تیّاریوں میں مصروف تھے۔ اچانک انہیں کلاس کے اندر آتے دیکھ کر سبھی لڑکے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لیکن یہ کیا۔؟ کلاس روم میں داخل ہوتے ہی انہوں نے وہاں موجود طالب علموں کو اندھا دھند مارنا شروع کر دیا تھا ـــ کسی کی انگلی پھٹ گئی۔ کسی کا انگوٹھا ٹوٹ گیا۔ کوئی لنگڑا رہا تھا۔ اور کوئی خون سے لت پت تھا۔ چیخنے چلاّنے کی آواز سن کر پرنسپل، اسٹاف اور سینکڑوں بچّے وہاں جمع ہو گئے۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ڈاکٹر صدّیقی کو ریٹائرمنٹ کے دن آخر ایسا کیا ہو گیا کہ وہ پاگلوں کی طرح بچّوں پر چھڑی سے ٹوٹ پڑے۔

لیکن گرین ڈائری کو سب کچھ معلوم تھا۔

قلم بھی مسکرا رہا تھا۔

اس لئے پولس جیپ میں بیٹھتے وقت میڈیا کے کیمرے میں ان کا چہرہ پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

☆

رشتوں کی نئی اسکیم

اسٹیج پر پردہ گرا ہوا ہے۔
بیک گراؤنڈ سے مدّھم آواز اُبھرتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے پورے ہال میں پھیل جاتی ہے۔

مصنّف اپنی تخلیق کا پہلا قاری لیکن ناقد آخری ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک ڈرامہ اپنے انجام تک نہیں پہنچ جائے تب تک سامع بنے رہیں۔ ورنہ ڈرامے کے' اجزائے ترکیبی' بکھر جائیں گے۔ سارے کردار کہانی کی بندش سے آزاد ہو جائیں گے۔ باپ، بیٹا، بہو اور نوکرانی میں سے آپ کس کس کو پکڑ کر منچ پر لائیں گے، کہاں کہاں ڈھونڈیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں آپ اِدھر اُدھر کہیں سے ڈھونڈ نکالیں، لیکن انہیں کہاں ڈھونڈیں گے جو اس دنیا میں نہیں ہیں ـــــ رشتوں کی نئی اسکیم پر آدھارت ڈرامہ میں 'ساس' کی موت کے بعد جو خلاء پیدا ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں ہی یہ ڈرامہ لکھا گیا ہے۔ پوتا، پوتی، بُوا، دائی، سہیلی، اور نوکرانی کی ماں کی حیثیت ضمنی کردار کی ہے۔ جو سامنے آ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی، ایک کردار جو تمام کہانیوں میں، ڈراموں میں سب سے اہم ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کھل کر سامنے نہیں آتا۔ وہ ہے مصنّف ۔ اس کے علاوہ سامع، قاری اور ناقد بھی اس ڈرامہ کے ہی کردار ہیں۔ جسے آپ کلائمکس میں منچ پر ایک ساتھ دیکھیں گے۔

خصوصی مہمان آچکے ہیں۔ پردہ اب بھی گرا ہوا ہے۔ ڈرامہ شروع ہونے میں وقت ہے۔ منتظمین اس کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ خصوصی مہمان کو پردہ کے پیچھے لے جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے کلاکاروں سے ملواتے ہیں۔

کردار نمبر ایک ــــ 'بیٹا'

میں نظیر احمد ولد ظہیر احمد، عمر پینتس سال، محلّہ آزاد نگر، جمشید پور۔ اپنے پورے ہوش و ہواس کے ساتھ اس ڈرامے کے کردار کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس وقت چونکہ اس کردار کا مکھوٹا پہنے ہوئے ہوں۔ اس لئے میں 'میں' نہیں ہوں۔ 'میں' وہ ہوں جو کردار ہے۔ میں نظیر احمد ہوتے ہوئے بھی اس ڈرامے کا کردار نمبر ایک یعنی 'بیٹا' ہوں۔ صرف بیٹا۔ ایسا بیٹا جو آج کے اس فیشن ایبل دور میں کسی کے بھی گھر جنم لے سکتا ہے۔

امّی کو سا کچی قبرستان میں دفن کر کے جب میں ابّو کو حوصلے کے کاندھوں پر بٹھائے گھر پہنچا تو اس وقت تک رات اپنے پنکھ پھیلا چکی تھی۔ میں ابّو کو ان کے کمرے میں پہنچا کر عزیز وا قارب کو ہدایتیں دے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ دونوں بچّے بیڈ کی دوسری جانب زمین پر چٹائی بچھائے اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ بیوی پژمردگی کی حالت میں بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی سوجی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں۔ پھر ہم دونوں بیڈ پر لیٹ گئے۔ آنکھیں بار بار چھت سے جھولتے پنکھے پر پڑ رہی تھیں۔ آج پنکھا بھی دھیرے دھیرے گھوم رہا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر بیوی سے رہا نہیں گیا۔ وہ روہانسی ہو گئی ــــ ''آپ دن بھر آفس میں رہتے ہیں۔ میں بھی دن بھر مال کے کاؤنٹر پر بیٹھی پیسے وصولتی رہتی ہوں۔ بچّے بھی اسکول، ٹیوشن، دوست اور سہیلیوں میں مگن رہتے ہیں۔ دفتر کے بعد جب ابّو اکیلے گھر پر ہوں گے تب ان کی دیکھ بھال کے لئے کسی نہ کسی کو تو رکھنا ہی پڑے گا۔''

میں پرائیوٹ نیشنل کمپنی میں کلرک ہوں۔ میرے سارے دوست مغربی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ میری مغربیت پر امّی اکثر ڈانٹ پھٹکار لگاتی رہتی تھیں۔ آفس کے بعد ابّو

کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے لاڈلے کو راہِ راست پر لاتے۔ سدھارنے کا شارٹ کٹ راستہ اپناتے ہوئے انہوں نے میری شادی کردی۔ میری خوش قسمتی دیکھئے کہ شادی کے فوراً بعد میری مشرقی بیوی اپنے لمبے بالوں کو بونسائی کروانے کے لئے خود سے تیّار ہوگئی۔ اس لئے اسے اب میری مغرب پرستی پر اعتراض بھلا کیوں ہوتا۔ مجھے بھی اس کے کلب اور پارک جانے پر اعتراض نہیں تھا۔ لیکن گھر والے اس سے ناخوش تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ آہستہ آہستہ اس نے اپنی سوجھ بوجھ سے سب کچھ ٹھیک کرلیا۔ چاہے وہ کچھ بھی کررہی ہو۔ جتنی بھی تھکی ہاری ہو۔ پر وہ وقت نکال کر امی ابّو کی خدمت کرنا نہیں بھولتی۔ پھر کیا تھا؛ جیسا وہ چاہتی گھر میں ویسا ہی ہونے لگا تھا۔ ابّو کی لوٗنا بیچوا کر پہلے اسکوٹر خریدوائی۔ پھر بائیک۔ اور پھر ایک دن ابّو نے اس کے کہنے پر سوشل اِسٹیٹس کو مینٹین کرنے کے لئے لون وغیرہ لے کر کار خرید لی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ''جتنے پیسے آپ اور ابّو کماتے ہیں وہ تو بچّوں کی فیس، کرایہ، موبائل، پارٹی، کیبل۔ سی ڈی، پٹرول، نوکرانی اور سوشل اِسٹیٹس میں ختم ہوجاتے ہیں۔ اس لئے چاہتی ہوں کہ میں بھی گھر کے خرچ میں برابر کی حصّہ دار بنوں ــــ پہلے امّی اور ابّو اس کے مال میں کام کرنے کے لئے تیّار نہیں ہوئے۔ لیکن بچّوں کے فیوچر اور بہو کی ضد نے انہیں سوچنے پر مجبور کردیا۔ وہ خاموش ہوگئے کہ چلو اسی بہانے اگر پوتا پوتی ڈاکٹر انجینئر بن گئے تو ان کا ہی نام روشن ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہدایت بھی کر گئے کہ ''فضول خرچی بند کرو اور زندگی گذارنے کے لئے پلان تیّار کرو۔ بغیر پلاننگ کے کسی بھی کام میں پائداری نہیں آسکتی۔ پھر میرے پیسے سے ہی گھر کا خرچ چلتا ہے۔ اور پھر تم ادھر دیکھ بھی رہے ہو کہ تمہاری امّی کی بیماری میں ان دنوں بہت خرچ ہورہے ہیں۔ اس لئے فی الحال میں پیسہ نہیں دے سکتا ــــ'' لیکن افسوس کہ کچھ ہی دنوں کے بعد امّی اس دنیا سے چل بسیں۔ اس کے بعد ہر ماہ تنخواہ میں سے ابّو اتنی رقم جتنی امّی کے علاج میں خرچ ہوتے تھے، میرے حوالے کرنے لگے۔ ایک دن میں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اِدھر تین سالوں میں لاکھوں روپئے علاج کے نام پر پانی میں بہہ گئے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ یہی روپئے اگر وقت پر ملے ہوتے تو دونوں بچّوں کا ایڈمیشن کسی اچھے ریزی ڈینسیل اسکول میں کروایا ہوتا۔ خیر دیر سے

ہی سہی لیکن اب وہ پیسے کام آنے لگے تھے۔ لیکن اب جب کہ ابّو کے ریٹائر منٹ میں تین سال رہ گئے تھے تو ان کی صحت کی فکر کچھ زیادہ ہی ستانے لگی تھی۔ ایک دن بیوی اخبار اُلٹ رہی تھی۔ مادّی دور میں گلوبلائزیشن سے پیدا ہونے والے کمپٹیشن نے ہر پروڈکٹ کو نئی نئی اسکیموں کے ساتھ بازار میں لانچ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایک کے نیچے لکھا تھا۔'' پرانی دے کرنئی لے لیں۔'' وہ اچھل رہی تھی۔ چلاّ رہی تھی۔ '' دیکھئے یہ ایک بہت آکرشک اسکیم ہے۔ بعد میں نہیں کہئے گا کہ میں نے بتایا نہیں۔'' اس اسکیم کے تحت میری بیوی نے اپنی بوڑھی نوکرانی کو سہیلی کی جوان نوکرانی سے بدل لیا۔ اس پر ابّو خفا ہوئے تو صفائی سے کام نہ کرنے کا الزام اس کے سر تھوپ دیا۔ جب ابّو کو پیر کے جوڑ جوڑ میں درد رہنے لگا تو دھیرے سے اس نے ابّو کے ہاتھوں میں بیساکھی تھما دی۔ پاؤں میں خود بخود طاقت آ گئی۔ وہ بہو کو پہلے سے بھی زیادہ پیار کرنے لگے۔ میں بھی اپنی بیوی کی ذہانت کا آہستہ آہستہ مرید ہو گیا۔

کردار نمبر دو ۔۔۔ 'بہو'

میں شہرت خانم زوجہ نظیر احمد، عمر اکتیس سال، آزادنگر، جمشید۔ اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ ڈرامہ کے کردار نمبر دو سے آپ کی ملاقات کروانے جا رہی ہوں۔ وہ ایک 'بہو' ہے ۔ میں اس ڈرامے میں اسی کا کردار نبھا رہی ہوں ۔ جسے ساس بے اِنتہا پیار کرتی تھی۔ سسُر تو اسے آج بھی دنیا کی سب سے اچھّی بہو تسلیم کرتے ہیں۔ میرے چہرے پر یہ جو مکھوٹا ہے۔ اسی کا ہے۔ اس لئے اب میں شہرت خانم نہیں، ڈرامے کی بہو ہوں۔ ایک ایسی بہو جس کی تعریف کرتے آج بھی محلّے والے نہیں تھکتے۔

میری پرورش مذہبی پیڑوں کی چھاؤں میں ہوئی۔ باہر دھوپ میں نکلنے کا مطلب نقاب کی چھتری سر پر رکھنا۔ میرے رشتہ داروں میں کچھ لڑکیاں جو انگلش میڈیم سے پڑھ رہی تھیں۔ مہینے میں ایک دو بار بیوٹی پارلر جایا کرتیں۔ فیشن ایبل کپڑے پہن کر پارٹیوں میں شریک ہوا کرتیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے رشک ہوتا تھا۔ لیکن جب میری شادی کردار نمبر

ایک سے ہوئی تو لاشعور کے تہہ خانے میں برسوں سے سرد پڑی بیوٹی پارلر دیکھنے کی خواہش میں اچانک اُبال آ گیا۔ بونسائی ہیئر کٹ پر ساس سسُر سے خوب ڈانٹ پڑی۔ لیکن اس ڈانٹ میں غصّہ کم پیار زیادہ تھا ۔رخصتی کے وقت اک سہیلی نے کان میں کہا تھا۔''اگر گھر کی آنکھوں کا تارا بننا ہے تو سب سے پہلے 'ساس' کے دل پر قبضہ کرو۔ دھیرے دھیرے ساری سلطنت تمہاری ہو جائے گی۔''اس کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے امّی کو روزانہ تیل کی مالش کرنے لگی۔ ہر روز نہلا دھلا کر پریس کئے کپڑے پہنانے لگی۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر انہیں سنوارنے لگی۔ ان کا پسندیدہ کھانا دسترخوان پر سجانے لگی۔ حالانکہ شروع شروع میں، میں سسُر صاحب کے لئے زیادہ کچھ نہیں کرتی تھی ۔لیکن پھر بھی سسُر صاحب مجھ سے خوش رہا کرتے تھے۔ میرے شوہر اکثر مجھ سے کہتے۔''تمہارے اندر جادو ہے۔'' ادھر جب امّی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی تب ابّو کی صحت پر بھی مضر اثرات پڑنے لگے تھے۔ اکثر ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا۔ کبھی کبھی امّی کے ساتھ ابّو کو بھی سنبھالنا پڑتا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا ـــــ اس رات امّی کو دل کا دورہ پڑا۔ میں کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ ابّو امّی کو سنبھالے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہسپتال پہنچنے سے قبل یکا یک راستے میں ایک زوردار ہچکی آئی اور امّی ابّو کی بانہوں میں جھول گئیں۔ اس کے بعد ابّو کبھی ریگولر ڈیوٹی نہیں کر پائے۔ صحت دن بہ دن خراب رہنے لگی۔ میں ان کا ہر ممکن خیال رکھتی۔ لیکن صحت گرتی ہی جارہی تھی۔ ایک طرف ان کی صحت گر رہی تھی اور دوسری طرف ہمارے مستقبل کے سرسبز پتّے شاخوں پر زرد ہو رہے تھے۔ ایسے میں بھلا ہو مادّی دور کی نئی اسکیموں کا جس نے مجھے بھروسہ دیا۔ لیکن میرے شوہر کو قطعی امّید نہیں تھی کہ اس اسکیم پر میں 'بہو' ہو کر اپنے سسُر سے کھل کر بات کر پاؤں گی۔ لیکن میں نے بھی ٹھان لی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے اس سلسلے میں ان سے بات ضرور کروں گی ـــــ ایک رات سر دباتے وقت موقع غنیمت جان کر میں نے کہا۔

'' ابّو جان! اِدھر جب سے آپ کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔ میں فکر مند ہوں۔ آپ بیماری کی وجہ سے جب گھر پر ہوتے ہیں تو آپ کا بیٹا دفتر میں، میں مال میں اور بچّے باہر۔ ایسے میں کسی دن آپ کو کچھ ہو گیا تو.....؟ اللہ نہ کرے کہ ایسا ویسا کچھ ہو۔ پھر بھی احتیاط ضروری

ہے۔'' بات بدلتے ہوئے میں نے آگے کہا۔ ''ویسے بُوا کو تینوں وقت کا کھانا تو ہم دیتے ہی ہیں اور اوپر سے ہزار روپئے بھی۔ اب انہیں ٹھیک سے دکھتا بھی نہیں ہے۔ گھر کی چابھی سونپنے میں رِسک ہے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ کوئی دوسری نوکرانی لے آؤں۔ جو ضرورت پڑنے پر آپ کو اسپتال وغیرہ پہنچا سکے۔'' میری اس بات پر پہلے وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر بولے۔''بُوا کا کیا ہوگا۔؟'' ''اس کے کام کا انتظام میں نے اپنی سہیلی کے یہاں کر دیا ہے۔ اُسے ہزار کی جگہ وہاں بارہ سومل رہے ہیں۔'' بولے ۔ ''اچّھا چلو جیسی تمہاری مرضی ۔ میں اب بس چند روز کا مہمان ہوں۔'' میں نے فوراً ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی بات نہیں کرتے ابّو! ابھی تو آپ کو پوتا پوتا کی شادی دیکھنی ہے۔'' پھر پلان کے مطابق میں نے کہا۔''شادی سے ایک بات یاد آئی''۔ ''کون سی بات....؟'' شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''ایک نیوز چینل میں بوڑھے مردوں کی لمبی عمر کے لئے آزمودہ نسخہ بتایا جارہا ہے۔ امریکن ڈاکٹر نے آج سے بیس سال قبل زندگی سے لڑرہے ایک ستّر سالہ بوڑھے مریض پر یہ انوکھا تجربہ کیا تھا۔ اس بوڑھے کی شادی ایک پینتس سالہ عورت سے کروادی تھی۔ آج وہ نوّے سال کا ہے اور اب بھی اس میں جینے کی تمنّا باقی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس عمر میں ایسی شادی سے مریض اتنا خوش ہو جاتا ہے کہ اپنی جوان پارٹنر کو پاکر خود بھی جوان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور یہی خوش کُن احساس اسے دوبارہ زندگی سے جوڑ دیتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں تھوڑی شرمائی تھی۔ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی تھی اور ان کے چہرے پر آتی جاتی لہروں کو دیکھنے لگی تھی کہ یکا یک ان کا چہرہ مجھے پہلے سے بشاش نظر آیا۔ منصوبے کے مطابق نظیر میاں بھی وہاں آدھمکے۔ انہوں نے بھی ہری جھنڈی دکھادی۔ آنکھوں میں قوس وقزح کے رنگ مسکرانے لگے۔ لیکن یکا یک پھر کچھ ایسا ہوا کہ جیسے آسمان میں بادل چھا گئے ہوں اور زور زور سے بجلی چمک رہی ہو۔ اس ملگجی روشنی میں ابّو کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں باہر نکل آئیں ۔ آواز میں ایک طرح کی گھن گرج تھی ـــــ ''تم دونوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔؟ نہیں چاہئے مجھے لمبی عمر۔ جتنا جینا تھا میں جی چکا۔'' دو تین دن تک انہوں نے کسی سے بات نہیں کی۔ چہرے پر تناؤ تھا۔ ہم لوگ

بھی ان کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ لیکن چوتھے دن جب ناشتہ لے کر ان کے پاس پہنچی اور بیڈ پر رکھ کر ابھی پلٹی ہی تھی کہ ان کی غصّیلی آواز نے میرے پاؤں کو کپکپا کر رکھ دیا۔ ''یہ کیا ناشتہ ابھی سے لے آئی ہو۔ جانتی نہیں کہ آج سنڈے ہے۔'' میرے پاؤں وہیں جم گئے۔ پھر وہ میری طرف بڑھتے ہوئے مسکرائے اور ہیئر کلر کی شیشی دیتے ہوئے بولے۔'' پہلے اسے لگا کر کے تو دیکھوں کہ کیسا لگتا ہوں۔ پھر تمہاری بات پر غور کروں گا۔ لیکن زمانہ کیا کہے گا۔؟'' وہ اندر سے اب بھی کچھ گھبرا رہے تھے۔ پھر اس کے بعد کیا تھا؛ ہم دونوں نے زمانے کی پرواہ کئے بغیر ایک غریب عورت کی تلاش شروع کر دی۔ ویسے مردوں کی عمر خواہ کچھ بھی ہو لیکن خطرہ بنا رہتا ہے۔ ایک دو دن میں ہی نظیر نے یہ معلوم کر لیا کہ ابّو کو ایک ایکسٹرا انکریمنٹ ملتا ہے۔ ایک دن ابّو کی غیر موجودگی میں وہ ان کے آفس پہنچ گئے۔ آفس والوں سے جان پہچان تو تھی ہی، بات ہی بات میں ابّو کا پے رول نکلوالیا۔ اسے دیکھ کر ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ کیوں کہ وہ انکریمنٹ جوان کے پے میں جُڑا ہوا تھا، وہ ابّو کی وجہ سے نہیں بلکہ امّی کے آپریشن کی وجہ سے مل رہا تھا۔ اس صورت میں وارث کا خطرہ لاحق تھا۔ کون غریبی میں جائداد بنٹواتا۔ اس لئے اب غریب کے ساتھ ساتھ بانجھ عورت کی تلاش جاری ہوئی۔ جو ایکسچینج آفر کے تحت میری سہیلی کے گھر جا کر ختم ہوئی —— لیکن اب سوال یہ تھا کہ سہیلی کی اس نوکرانی کو ایک بوڑھے مریض کے ساتھ شادی کے لئے راضی کیسے کیا جائے۔؟ یہ ذمّہ میری سہیلی نے اپنے اوپر لے لیا۔ کیوں کہ اسے جلد سے جلد اس جوان نوکرانی سے چھٹکارا پانا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت شریف تھی۔ لیکن پہلے ہی دن سے اس کے مرد کی اس پر بُری نظر پڑنے لگی تھی۔ اس سے قبل بھی وہ دو تین نوکرانیوں کے ساتھ اُلٹی سیدھی حرکتیں کر چکا تھا۔ سہیلی کو بھی جلدی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن مجھے لے کر اس کے گھر پہنچی۔ بوڑھی بیمار ماں نے بتایا کہ قریب بارہ سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ لیکن بانجھ کہہ کر اس کے سسرال والوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ شادی نہیں کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جب ہم دونوں نے ماں اور بیٹی کو بہت سمجھایا تو دس ہزار روپے کے بدلے وہ اس شادی کے لئے راضی ہو گئی —— وہ 'بانجھ' ہے یہ سبھی جانتے تھے لیکن یہ معلوم رہنے کے بعد بھی میں اسے

نرسنگ ہوم لے گئی۔ میری چھٹی حس کام آئی۔ حیرت انگیز طور پر جانچ کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ 'بانجھ' نہیں ہے۔ اس لئے اسے دو تین دن اور ہسپتال میں رہنا پڑا۔ پندرہ دن کے آرام کے بعد اسے میں اپنے گھر لے آئی۔ ایک مہینے کے بعد قاضی اور گواہوں کی موجودگی میں مستقبل کے شادیانے بجے، نئے باب لکھے گئے۔ سروس بک میں نئی شریکِ حیات کا نام درج کیا گیا۔

کردار نمبر تین ــــ 'نوکرانی'

میں امیرن سبزی والی، لڑکی فقیرن سبزی والی کچھ دنوں سے کردار نمبر چار کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ کیا ہوش اور کیا ہواس میرا۔ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ اس ڈرامے میں میری پہلی اِنٹری نوکرانی کے طور پر ہوتی ہے۔ اور پھر جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ میں نہایت ہی غریب اور ساتھ میں بانجھ بھی ہوں تو کردار نمبر چار کی گھر والی بن جاتی ہوں ــــ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے چہرے پر کوئی مکھوٹا نہیں لگا رکھا ہے۔ کیوں کہ میں جس کردار میں ہوں وہ اتنی بے بس، بے سہارا مجبور اور دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والی عورت ہے کہ اگر کوئی عورت اس کردار کو سچّے من سے اپنے اندر اُتار لے تو اُسے کسی میک اپ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس لئے کہ عورت بہت حسّاس ہوتی ہے۔ عورت کا دُکھ عورت کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا۔ آپ بھی اس کردار کو اسٹیج پر دیکھ کر حیرت میں پڑ جائیں گے کہ یہ ایک بوڑھے مریض کی بیوی کیسے بن گئی۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ دنیا کے اسٹیج پر ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے۔ اس میں قصور ایک دوا اور نہ ہی کردار نمبر چار کا ہے۔ قصور میرا ہے کہ میں غریب ہوں اور اوپر سے عورت.....اور اب آپ کردار کی زبانی سنئے:

میرا باپ کون تھا یہ صحیح سے کسی کو پتا نہیں۔ یہاں تک کہ میری ماں کو بھی نہیں۔ ایک رات میری نانی جو دن بھر بھیک مانگنے کے بعد شام ڈھلے گھر لوٹی تھی اور جوٹھن میری ماں کو کھلا کر ابھی آرام کرنے ہی والی تھی کہ پڑوس کا ایک آدمی بچی ہوئی بریانی کے بہانے انہیں بُلا کر اپنے گھر لے گیا۔ نانی کے نکلتے ہی ایک دوسرا شخص کھولی میں گھس آیا۔ میری ماں

جو اس وقت پندرہ سولہ سال کی رہی ہوگی۔ان کے ساتھ اس شخص نے زبردستی منہ کالا کیا۔ میری نانی جب کھانا لے کر لوٹنے لگی تو وہ آدمی برتن دھونے کے لئے ضد کرنے لگا۔نانی کو کچھ گڑبڑ لگا۔وہ فوراً وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔گھر میں پہنچی تو دیکھا کہ ماں چھٹپٹا رہی ہے۔منہ میں کپڑا اٹھونسا ہوا ہے۔اور ایک آدمی......انہوں نے سامنے رکھے جھاڑو سے اسے مارنا شروع کیا۔لیکن غصّے میں اس کمینے نے نانی کے پیٹ میں چھُرا گھونپ دیا —— پورے نومہینہ تک میری ماں کیسے زندہ رہی یہ تو وہ دائی ہی جانتی ہے۔جس نے ماں کو سہارا دیا۔جب میں پیٹ میں تھی تب بھی ماں کے ساتھ لوٹ کھسوٹ ہوتا رہتا تھا۔لیکن میری پیدائش کے بعد کسی طرح ماں نے ان لٹیروں سے اپنے آپ کو بچایا۔اور پھر تھوڑے بہت پیسے اِدھراُدھر سے جمع کر کے مجھے اپنی پیٹھ پر باندھ کر فٹ پاتھ پر چلی آئی۔سبزی بیچنے لگی۔ لوگ اُسے فقیرن سبزی والی کہنے لگے۔میں بچپن میں بہت خوبصورت تھی۔غریب کی خوبصورتی اکثر امیروں کے کام آتی ہے۔شاید اسی لئے میرا نام امیرن رکھا۔میں سبزی کی دکان میں بیٹھا کرتی تھی۔ایک کھاتے پیتے گھر کا نوجوان اکثر میری دکان پر سبزی لینے آیا کرتا تھا۔ اُس نے چپکے سے ماں کو راضی کرلیا۔میں بھی اپنی قسمت پر پھولی نہیں سمارہی تھی۔ لیکن سات سال تک جب میں ’ماں‘ نہیں بن پائی تو انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ایک بچّے والی عورت سے شادی کرلی۔اس غم میں میری ماں بیمار رہنے لگی۔سبزی کی دکان بند ہوگئی۔ میں اِدھراُدھر کام کر کے ماں کا علاج کرانے لگی۔اِدھر کچھ مہینے سے میں کردار نمبر دو کی سہیلی کے یہاں کام کررہی تھی کہ ایک دن میری مالکن یعنی سہیلی نے مجھے کردار نمبر دو سے ملوایا۔ جس نے کردار نمبر چار کے ساتھ شادی کی بات چلائی۔ویسے میں شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن دس ہزار روپئے دیکھ کر مجبوراً پگھل گئی۔نرسنگ ہوم سے لوٹنے کے بعد جب ماں کو ہسپتال لے جانے کے لائق ہوئی تو میری ماں اس دنیا سے چل بسیں۔وہ دس ہزار روپئے کام نہیں آئے۔میں پیسے لوٹا کر شادی سے انکار کرنے والی تھی۔لیکن یہ سوچ کر کہ تین وقت کے کھانے کے عوض مجھے کسی نہ کسی کے ساتھ تو سونا ہی پڑے گا۔چاہے نوکرانی بن کر یا پھر.....پھر میں کیوں نہ عزّت کے ساتھ بوڑھے کے ساتھ سوؤں۔جب تک زندہ رہی

رہنے کے لئے چھت تو مل ہی جائے گی ـــــ دوسرے دن کردار نمبر دو سہیلی کے یہاں پھر آئی۔ مجھے ایک سوٹ دے کر بولی کہ نہا کر پہن لو۔ گھومنے چلنا ہے۔ اس نے اس دن اپنے ہاتھوں سے میرا میکپ کیا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ بوڑھے سے ملوانے لے جارہی ہیں۔ لیکن لے کر کہاں گئیں۔؟ ایک نرسنگ ہوم میں۔ جہاں میرا چیکپ کروایا گیا کہ میں 'بانجھ' ہوں یا نہیں۔ مجھے اس بات پہ ہنسی آ گئی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ میں اپنے جیسے کو جنم دے سکتی ہوں تو میرے پیٹ کی دیواروں میں تیزی سے کیڑے رینگنے لگے۔ اس وقت کردار نمبر دو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جو دیکھنے کے لائق تھا۔ انہوں نے فوراً مجھے ریجیکٹ کر دیا۔ یہ کہہ کر ''کہ تم 'بانجھ' نہیں ہو۔'' شادی کینسل کا مطلب تھا کہ دس ہزار روپئے کا میرے ہاتھ سے نکل جانا۔ بیمار ماں کو کھو دینا۔ میں اس وقت ان کے پیروں پر گر گئی۔ جب 'بانجھ' نہیں تھی تب بھی 'بانجھ' تھی اور اب جب 'بانجھ' نہیں ہوں تب بھی میں 'بانجھ' بننا چاہتی ہوں۔ دس ہزار روپے کے بدلے میں، میں نے اپنا آپریشن کروالیا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ آپریشن کے کچھ ہی دن بعد میری ماں مرگئی۔ موت کے پندرہ دن بعد میں نوکرانی بن کر کردار نمبر دو کے گھر آ گئی۔ ایک مہینے کے بعد میرا نکاح کردار نمبر چار کے ساتھ کر دیا گیا۔ اب میں ان کی بیوی ہوں۔ اس گھر کی مالکن.....اپنی عمر سے بڑے 'بیٹے' اور اپنی عمر کی برابر 'بہو' کو پا کر میری دنیا بدل گئی ہے۔ میں دنیا کی سب سے خوش قسمت نوکرانی ہوں جسے اس طرح سے 'ماں' کا درجہ ملا ہے۔

کردار نمبر چار ـــــ 'باپ'

میں ظہیر احمد ولد وزیر احمد، عمر ۷۵ سال، آزادنگر، جمشید پور۔ اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ کردار نمبر چار جو اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کا تعارف آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ـــــ اس مکھوٹا میں اور مکھوٹا کے بغیر بھی آپ مجھے ظہیر احمد ہی سمجھیں۔ کیوں کہ اب میری عمر بھی کردار نمبر چار کے برابر ہے۔ جب تک میں اس کردار کو نہیں جی رہا تھا تب تک زندگی کا یہ ڈرامہ میری سمجھ سے پرے تھا۔ لیکن جیسے جیسے اس کردار کے مکالمے رٹنے لگا ویسے ویسے میرے بیٹے اور بہوؤں پر ایسا اثر ہوا کہ وہ بھی ان دنوں میری شادی کی

تیّاریوں میں مصروف ہیں۔اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس ڈرامہ کے منچ پر کھیلے جانے کے بعد ہر گھر میں کردار نمبر چار اسی بھومیکا میں نظر آئیں گے۔

میری شادی ہوئی اور میں جلد ہی ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔جس وقت میں باپ بنا،اس وقت میں ڈی سی آفس میں ایل ڈی سی تھا۔بیٹے کو پڑھا لکھا کر اچّھا بنانے کی چاہت میں میں نے یو ڈی سی کا انٹرنل امتحان دیا اور پاس کر گیا۔بیٹا جب میٹرک میں پہنچا تو میں آفس سپرنٹینڈنٹ بن گیا۔میں خوش تھا کہ اس دور میں جب 'دو اور دو' کے نعرے زور پکڑنے لگے تھے۔میں نے اکلوتی اولاد کی مستقبل سازی کے لئے بیوی کو سمجھا کر اس کی نس بندی کروادی تھی ـــــ لیکن جب میری دوسری شادی کی بات شروع ہوئی اور بہو کو من پسند ساس مل گئی تب ایک ڈر بیٹا بہو کو ستانے لگا کہ کہیں مجھ سے اس عمر میں کوئی اولاد نہ ہو جائے۔ملکیّت،وارث اور بٹوارہ کے خوف نے میرے بیٹے کو ایک دن دفتر پہنچا دیا۔ اس دن میں گھر پر آرام کر رہا تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کی یہ اِنکریمنٹ ممّی کی وجہ سے مل رہا ہے تو پیسوں سے خریدی ہوئی ایک عورت کی نس بندی کروا کے اسے میرے لئے بانجھ بنا دیا ۔لیکن اس کے بعد بھی ایک ڈر انہیں ستا تا رہا کہ میری موت کے بعد کہیں وہ کسی کے بہکاوے میں نہ آ جائے۔گھر کا بٹوارہ نہ ہو جائے۔آج کے اس دور میں جہاں بچّے،بوڑھے ماں باپ کو اولڈ ایج ہوم میں ڈال رہے ہیں،وہیں میرے بہو بیٹے نے میری خوشی کی خاطر جو کچھ کیا،وہ آج کون کرتا ہے.....؟ لیکن آج بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ جب برابر میں ذہنی یکسوئی زیادہ فراہم ہوتی ہے تو پھر خول میں سمٹی' بوا' کی جگہ کسی تجربے کی کیا ضرورت تھی۔جب کہ جوان عورت غیر تندرست مرد کے لئے گنّا پیڑنے والی مشین ہوتی ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی میں نے جو فیصلہ کیا ہے،وہ کتنا صحیح ہے یہ میں نہیں جانتا ۔میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں نے جو کیا ہے۔وہ مستقبل کو دیکھتے ہوئے کیا ہے میری طرح آپ کے پاس بھی جب ایسے خدمت گزار بہو بیٹے ہوں گے تو پھر نہیں چاہتے ہوئے بھی آپ کو ان کی خوشیوں کی خاطر اس طرح کے رشتے بنانے پڑیں گے۔بڑھاپے میں لمبی عمر کی تمنّا کون نہیں کرتا۔؟

مصنّف

میں اختر آزاد ولد محمّد حسین، عمر بیالس سال، آزادنگر، جمشید پور۔ اپنی تمام تر علمی لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے ڈرامہ کے تمام کرداروں سے آپ کا تعارف کروانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کردار نمبر ایک سے لے کر کردار نمبر چار تک نے میرے اس ڈرامہ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے جس طرح دن رات محنت کی وہ لائقِ ستائش ہے۔ اور کرداروں کی روح میں اُتر کر 'ساس' کی موت سے پیدا ہوئے خلاء کو پُر کرنے کی کوشش میں 'نوکرانی' کو 'گھروالی' بنا کر جس طرح سسُر کی زندگی سے خوشیوں کی لمبی راہ نکالی ہے۔ وہ بھی آج کے اس دور میں دیکھنے کو کہاں ملتا ہے ــــ لیکن جیسے جیسے زمانہ ترقّی کرتا جائے گا اور انسان غیر واضح سیّاروں کی تلاش میں چاند سے آگے نکل جائے گا، ویسے ویسے تہذیب شناسی کے نئے اسباق زندگی کے نصاب میں شامل ہوتے جائیں گے؛ اور انہی نصابوں میں سے ہر روز ایک نیا ڈرامہ جب رشتوں کی نئی معنویت کو اجاگر کرنے کے لئے زندگی کے اسٹیج پر کھیلا جائے گا تو کل کسی کو اس بات پر حیرت نہیں ہوگی، کیوں کہ اس وقت تک نئی نئی اسکیموں کے تحت رشتوں کے اور بھی مفاہیم بدل چکے ہوں گے....

جب آج اسکیم کے تحت بیٹے سے کم عمر کی 'ماں' باپ کی موت کے بعد بھی زندہ رہے تا کہ ہر ماہ نوکرانی کے پیسے بھی بچیں اور سرکار کی طرف سے ملنے والا 'پینشن' بھی برسوں ملتا رہے، اگر یہ اسکیم کارگر ہوئی، تو کل وہ دن دور نہیں جب باپ کی موت کے بعد، ہمارے ہی گھر کے کسی جوان' نوکر' کو ماں کے کمرے میں رہنے کے لئے جگہ مل جائے۔

یہ ڈرامہ بھی یہیں کھیلا جائے گا۔

اگر آپ اسے بھی دیکھنا چاہتے ہیں تو آج ہی ۰۹۵۷۲۶۸۳۱۲۲ پر ایس ایم ایس کر کے اپنا ٹکٹ بک کروالیں۔

☆

شُدّھی کرن

''اگر تم سب سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔ یا پھر گھر لوٹ آؤ۔ شُدّھی کرن کا کام جاری ہے۔ پھر نہ کوئی تمہیں ملیچھ کہے گا اور نہ کوئی تمہیں یہاں سے جانے کے لئے ہی کہے گا، کیوں کہ تب ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔''

☆

''ماں یہ ملیچھ کیا ہوتا ہے اور شُدّھی کرن کسے کہتے ہیں ۔؟''

''کیوں ــــ ؟ کیوں پوچھ رہا ہے یہ سب تو.....؟''

''نہیں ماں، بس ایسے ہی..... اپنا وہ پانڈے سر کا بیٹا ہے نا۔؟ آج اسکول میں کہہ رہا تھا کہ اس کے گھر میں کل رات میٹنگ ہوئی تھی۔ جس میں بہت سارے لوگ جمع ہوئے تھے۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ یہ ملیچھ باہر سے آئے ہیں۔ جس نے ہماری اس دھرتی کو اپوتر کیا ہے۔ انہیں اگر یہاں رہنا ہے تو اپنا شُدّھی کرن کروانا ہوگا۔ ورنہ دھرتی کی شُدّھتا کے لئے اس کا خون بہایا جائے گا۔ اس کا گوشت چیل کوؤں میں بانٹا جائے گا۔''

''نہیں نہیں! پانڈے سر کے گھر ایسی میٹنگ نہیں ہوسکتی۔ وہ تو برسوں سے گاؤں والوں کو اچّھائی اور سچّائی کا درس دیتے آئے ہیں۔''

''بھگوان کو پرشن کرنے کے لئے ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلنا ضروری ہے ماں۔؟ ماں پھر ہم لوگ کیوں نہیں کھیلتے.....؟ اگر ہولی ہم لوگوں کا بھی تہوار ہوتا تو کتنا مزہ

آتا۔ہم بھی ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلتے۔''

''ماں تم بتاتی کیوں نہیں.....؟ یہ ملیچھ کون ہیں اور شُدّھی کرن کسے کہتے ہیں۔؟''

ماں سوچ میں پڑ گئی۔ ماں کو سوچ میں غرق دیکھ کر وہ بھی سوچ میں ڈوب گیا کہ اس کی بات سن کر ماں یکا یک گم صم کیوں ہوگئی ہے۔اس نے صرف پانڈے سر کے گھر میں ہوئی میٹنگ کے بارے میں بتایا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ملیچھ اور شُدّھی کرن کے بارے میں پوچھا تھا۔اگر نہیں بتانا تھا تو نہیں بتاتی۔گُم صُم ہونے کی کیا ضرورت تھی۔پھر یکا یک خیال آیا کہ ماں اکثر کہتی رہتی ہے کہ اسے بلڈ پریشر ہے۔اسے نہیں معلوم کہ بلڈ پریشر کیا ہوتا ہے۔لیکن اسے لگا کہ کہیں اس کی ماں کو بلڈ پریشر تو نہیں ہوگیا۔وہ دوڑ کر گلاس میں پانی بھر لایا اور دراز سے دوا نکال کر ماں کو کھلانے لگا۔دوا کھانے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔اور اس کی بات سننے کے بعد بہت حد تک اسے ویسا لگنے بھی لگا تھا۔اس لئے ماں نے دوا کھالی۔کچھ دیر کے بعد ان کی طبیعت بحال ہوگئی۔

''ماں تمہیں کیا ہوگیا تھا۔؟ میری بات سُن کر تم خاموش کیوں ہوگئی۔میں نے آج تمہیں تنگ بھی نہیں کیا تھا۔میں نے تو صرف شُدّھی کرن کے بارے میں پوچھا تھا تم کہو گی تو اب سے نہیں پوچھوں گا۔کلاس میں پانڈے سر سے ہی پوچھ لوں گا۔''

بیٹے کی بات سن کر تو جیسے ماں کی جان نکل گئی۔انہوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں بیٹا،نہیں!تم اب اس سے نہیں پوچھو گے ورنہ جو ہولی کل آنے والی ہے۔وہ آج چلی آئے گی۔اور وہ لوگ بھگوان کو پرسّن کرنے کے لئے آج ہی دھرتی کو لال کر دیں گے۔''

بیٹے نے سوچا کہ بھگوان کو خوش کرنے کے لئے وہ لوگ دھرتی کو لال کریں یا پیلا۔ہولی آج کھیلیں یا کل۔اس میں ماں کو پریشان ہونے کی کیا پڑی۔اس لئے اس نے کہا۔

''وہ لوگ بھگوان کو پرسّن کرتے ہیں تو کرنے دو ماں۔اس میں تمہیں کچھ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ میں بھی دھرتی کو لال ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔بولو نا ماں،دیکھنے دو گی نا...؟''

''بیٹے ایسی باتیں نہیں کرتے۔تم ابھی چھوٹے ہو۔بارہ سال کی عمر میں تمہیں یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔بس کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گے۔اور یہ بات کسی کو بھی نہیں

بتاؤ گے.....ایک دو دن کے اندر ہم لوگ یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔''

''ایک دو دن کے اندر کیوں۔؟ ہم تو ہولی دیکھ کر جائیں گے۔ پھر دوسری جگہ کیوں۔؟ ابّو کے پاس چلیں گے۔'' پھر کچھ سوچتے ہوئے۔''ابّو کیسے ہیں ماں۔؟ جب وہ یہاں سے گئے تو میں کتنا چھوٹا تھا۔؟ میں اس وقت چلتا تھا یا نہیں۔؟ ابّو ، ابّو کہتا تھا یا نہیں۔؟'' پیار سے ماں کے چہرے کو چھوتے ہوئے۔''تمہیں تو سب یاد ہوگا نا ماں.....؟''

''ہاں بیٹا مجھے سب یاد ہے......'' یہ کہتے ہی ان کی آنکھوں کے سامنے شوہر کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ رونے لگیں۔

'' تم رو کیوں رہی ہے ماں۔؟ میں چلوں گا تمہارے ساتھ۔'' ماں کے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے۔ ''ابّو رہتے کہاں ہیں ماں۔؟ تم تو وہاں گئی ہوگی نا۔؟ راستہ تو معلوم ہے نا۔؟ ایسا نہیں کہ چلتے چلتے راستہ بھٹک جائیں۔ ابّو بھی نہ ملیں اور یہاں بھی نہ لوٹ سکیں۔ پھر کہاں جائیں گے ماں....؟''

بیٹے کی بات سن کر ماں کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں۔ انہوں نے سوچا کہ بیٹے سے بہت دنوں تک اس بات کو چھپا کر رکھنا اچّھا نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی تو بتانا ہی پڑے گا۔ یہ سوچ کر وہ بیٹے کو بانہوں میں بھر لیتی ہیں۔

'' بیٹے ابّو سے ملنے کا ارادہ دل سے نکال دو۔ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے کہ وہ دوسرے شہر میں کام کرتے ہیں۔ کبھی کبھی رات میں جب تم سو جاتے ہو تو وہ آتے ہیں اور صبح تمہارے اُٹھنے سے پہلے چلے جاتے ہیں...... اصل میں آج سے دس سال قبل بھی ایک ایسی ہی میٹنگ اُس گاؤں میں ہوئی تھی۔ اور ہولی کے دن ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی تھی۔ ملیچھ یہ لوگ ہم مسلمانوں کو کہتے ہیں۔ جانتے ہو کس لئے۔؟ کیوں کہ ہمارے باپ دادا کے باپ دادا جو کبھی ہندو رہے ہوں گے، اسلامی مساوات سے اتنے متاثر ہوئے کہ مسلمان ہو گئے۔ انہیں ہندوؤں نے ملیچھ کا نام دیا۔ اور واپسی کے سارے راستے بند کر دیئے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ اس طرح سے تو ایک ایک کر کے سارے مسلمان ہو جائیں گے، تب ہندو گول بند ہونا شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں ' شُدّھی

کرن‘ کی بنیاد پڑی۔اس کے تحت وہ ہندو جو مسلمان ہو گئے تھے،اسے ڈرا دھمکا کر دوبارا ہندو بنایا گیا۔۔۔تمہارے ابّو اپنی ضد پر اڑے رہے کہ ہم جان دے دیں گے،لیکن واپس اس گھر میں نہیں جائیں گے جہاں بھگوان کے درشن کے لئے چھوٹی ذات کو مندر میں گھسنے نہیں دیا جاتا۔ہندوستان سب کا ہے ـــــ آخر کار ہندوؤں نے انہیں مار کر شُدّھی کرن کی ہولی جلائی۔کسی طرح ان کے ایک ہندو دوست نے مجھے اور تمہیں بچا کر مہینوں اپنے گھر میں رکھا۔پھر جب حالات کچھ اچّھے ہوئے تو وہ ایک رات مجھے اس گاؤں میں چھوڑ گئے۔ اس وقت یہاں مسلمانوں کی تھوڑی آبادی تھی۔تب سے میں اسی گاؤں میں ہوں۔اس وقت تو صرف دو سال کا تھا۔‘‘

ماں بیٹے کو آغوش میں بھر کر چومنے لگتی ہے۔بیٹے کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے ہیں ۔کچھ دیر تک دونوں خاموش رہتے ہیں۔پھر بیٹا اپنے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے کہتا ہے۔

’’ماں یہ لوگ ہم مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر اپنے بھگوان کو پرشنّ کرتے ہیں....اس کا بھگوان کس مٹّی کا بنا ہے۔؟ جو انسانوں کا خون پیتا رہتا ہے۔آخر ہم لوگوں نے بگاڑا کیا ہے۔؟‘‘ وہ بولتے بولتے رک کر سوال کر بیٹھتا ہے۔

’’بیٹے یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔یہ تو شروع سے ہوتا آیا ہے۔لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے اپنی موجودگی کا دھماکے دار احساس دلایا اور ذات پات ،چھوا چھوت،اونچ نیچ کا درس قریب نو سو سالوں تک پڑھایا تو یہاں کے مظلوم جن کے ساتھ دھرم کے نام پر صدیوں سے استحصال ہوتا آیا تھا،اس میں سے بہت سارے مسلمان ہو گئے......انہی مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی کوشش میں بھاگل پور کے کھیتوں میں بیج کی جگہ انسانوں کی کھوپڑی بوئی گئی۔جمشید پور میں بچّوں اور عورتوں سے بھری ایمبولنس جلائی گئی۔مرادآباد میں نمازیوں سے بھری عیدگاہ کو نشانہ بنایا گیا۔ ممبئی۔بھیونڈی،میرٹھ اور نہ جانے کتنے شہروں میں انسانوں کی ہولیکا جلائی گئی۔ فیض آباد میں بابری مسجد کا انہدام کیا گیا۔گودھرا کے نام پر گجرات میں فرقہ پرستی کا ایسا وحشیانہ کھیل کھیلا گیا،جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔‘‘

''لیکن ماں پانڈے سر تو ایک دن کلاس میں بتا رہے تھے کہ بابری مسجد کی جگہ پہلے رام مندر تھا۔ جسے بابر نے توڑ کر مسجد بنا دیا تھا.....وہ کبھی مسجد تھی ہی نہیں۔ مندر تھا تو پھر ماں ہندوؤں نے اپنے ہی مندر کو کیوں توڑ دیا۔ کیا اس سے اس کا بھگوان رام خوش ہوا ہوگا؟''

بیٹے نے اپنے بستے سے رامائن نکال کر رام کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ پھر ماں کے سامنے بڑھا دیا۔ ماں نے تصویر پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

''بیٹا، رام کو تو مسلم بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر اقبال نے تو انہیں 'امام ہند' تک کہہ دیا ہے.....اب ایسا ہے کہ مسجد یا مندر کے ٹوٹنے سے بھگوان رام خوش ہوئے ہوں گے کہ نہیں یہ تو وہی جانیں، جس نے اس جگہ کو رام کا جنم استھان بتا کر اس کی بنیاد میں اینٹ پتّھر کی جگہ لاکھوں انسانوں کی ہڈّیاں ڈالی ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان پرانی یادگاروں کو جسے بچا کر رکھنا ہم سب کی ذمّہ داری ہے، اگر بچا نہیں پاتے تو بُزدل ہیں اور اگر مسمار کرتے ہیں تو قاتل ہیں۔ ایسے قاتلوں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔'' کچھ دیر وہ دم لینے کے لئے رکتی ہیں۔ پھر کہتی ہیں —''بیٹے وہ لوگ مسلم حکمرانوں کی یادگاریں ایک ایک کر کے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی قسمت کا تاج جو ساری دنیا میں اپنی مثال آپ ہے اس پر بھی زعفرانی نظر لگی ہوئی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی تاج محل کے سامنے بیٹھ کر کھینچوائی ہوئی ان کے شوہر کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ چہرے پر اداسی کے بادل چھا جاتے ہیں، جو آنکھوں سے ہو کر برسنے کے لئے بے تاب نظر آرہے ہیں۔

''ایک بات اور بتاؤں ماں.....؟ پانڈے جی کا بیٹا یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ملیچھوں نے ساری دنیا میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ امریکہ کا جو سب سے بڑا ٹاور تھا۔ پنٹا گن اور ولڈ ٹریڈ سینٹر.....کچھ ایسا ہی بول رہا تھا کہ ملیچھوں نے ہی توڑا ہے۔ کیا یہ سچ ہے ماں۔؟''

بیٹے کی بات سن کر وہ پہلے کچھ دیر چپ رہیں۔ مسکرائیں۔ پھر بولیں....

''ہاں بیٹا! جاپان کے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم ہم نے ہی گرائے ہیں۔ بوژنیا میں نسل کشی ہم نے ہی کروائے ہیں۔ افغانستان پر دہشت گرد ہونے کا الزام ہم نے ہی

لگائے ہیں۔ کیمیائی ہتھیار کے بہانے عراق کو نیست و نابود کرنے کے ناپاک ارادے ہم نے ہی بنائے ہیں۔ جمہوریت کا گھونا ناٹک رچا کر صدّام کا تختہ ہم نے ہی الٹے ہیں۔ ہم نے ہی فلسطین اور لبنان کے مظلوموں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ ہر وہ کام جو خلافِ انسانیت ہے، ہم نے ہی کئے ہیں......اور اب تو دنیا کی اقوام بھی یہی سمجھ رہی ہیں کہ دہشت گردی کا دوسرا نام مسلمان ہے۔ اب تو ہر طرف سے مسلمانوں پر یلغار ہونے لگا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ ساری دنیا کو اس بات کا ڈر ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی شرح پیدائش میں اگر روک نہیں لگائی گئی تو دنیا میں سب سے زیادہ تعداد ان کی ہو جائے گی۔ اس لئے سب نے منصوبہ بند طریقے سے ساری دنیا میں ایک طرح کی مہم چھیڑ رکھی ہے کہ مسلمانوں کو شُدّھی کرن کے نام پر اور کہیں دہشت گردی کے نام پر گھسیٹا جائے۔ اور دنیا کے منظر نامے کو دھندلا کر ایک نیا منظر نامہ ترتیب دیا جائے۔ مسلمانوں کے مورال کو کمزور کیا جائے تا کہ ہر میدان میں اسے شکست دی جا سکے''

''ماں یہ دہشت گرد کیا ہوتا ہے۔؟'' اس نے اس طرح سے پوچھا جیسے وہ سب کچھ جان لینا چاہتا ہو جو کچھ آج مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔''

''بیٹا پہلے مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن اخباروں میں پڑھ کر اور ریڈیو، ٹی وی میں سُن اور دیکھ کر یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ جو اپنی جانیں قربان کرتے ہیں، دوسروں سے اپنی تہذیب اور شناخت کی خاطر لوہا لیتے ہیں، اپنے مذہب پر چلتے ہوئے حق کے راستے پر شہید ہوتے ہیں، انہیں جاں بازوں کو شہید یا مجاہد نہیں کہہ کر آج کی عالمی اِصطلاح میں 'دہشت گرد' کہا جاتا ہے ـــــ لیکن میری ڈکشنری میں دہشت گردی کے دو معنیٰ ہیں۔ امریکہ اور بابری مسجد کو توڑنے والے لوگ۔ لیکن یہ سب کہاں کسی کو نظر آتے ہیں ۔ نظر آتی ہیں وہ تنظیمیں جو مذہب کی روشنی میں علم کی شمع روشن کرتی ہیں۔ وہ مدرسے جہاں غریب اور نادار بچّے پڑھتے ہیں، جہاں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ اس مدرسے پر دہشت گردی ٹریننگ کیمپ چلانے کا الزام تھوپا جاتا ہے۔ جو عیش و عشرت سے الگ سادی زندگی کی عمر بھر پیروی کرتے ہیں۔ ساری دنیا میں گھوم گھوم کر انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ وہ بھلا بم کی فیکٹری کیسے لگا سکتے ہیں۔؟ جسموں پر بم باندھ کر انسانوں کی لاشیں کیسے بکھیر سکتے ہیں۔؟

یہ سب جعل سازی نہیں تو اور کیا ہے۔؟ لیکن یہ سب ہم کس سے پوچھیں.....؟''

''نہیں ماں اب پانڈے سر سے تو بالکل نہیں پوچھنا۔'' وہ بولتے بولتے رکتا ہے ۔پھر کچھ یاد آتے ہی کہتا ہے۔ ''ماں! پانڈے سر کا بیٹا ایک سنترے رنگ کا پمپلیٹ بھی گھر سے چرا کر لایا تھا ۔اس میں کچھ ایسا ہی لکھا تھا۔ ہم دونوں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی ۔تبھی پانڈے سر آ گئے تھے۔ جسے جلدی سے میں نے اپنے بیگ میں چھپالیا تھا۔ پھر چھٹی ہو گئی۔ جاتے وقت وہ لینا بھول گیا۔ ابھی نکالتا ہوں۔

اُس پمپلیٹ میں لکھا تھا ـــــ

''مسلمان ایک عجوبہ قوم ہے۔ جو بہت تیز رفتاری کے ساتھ ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ ہم دنیا کی پرانی قومیں ہیں ۔لیکن ایسا لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں اس کی اکثریت ہم سے کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ اور ہم اس کے ماتحت ہو جائیں گے۔....اسے روکنے کے لئے ہمیں ہر محاذ پر شکست دینا ہے۔ کہیں اسرائیل بن کر، کہیں گجرات بن کر، کہیں لادین کو ڈھونڈنے کا بہانہ بنا کر، کہیں کویت کی حمایت کر کے، کہیں صدّام کو ڈکٹیٹر بتا کر، کہیں سعودی عرب کا پاسباں بن کر، کہیں کچھ اور کہیں کچھ بن کر ......اس قوم کو بدنام کر کے ہی ہم صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں۔ اگر ایسا کرنے میں ہم ناکام رہے تو وہ دن دور نہیں جب اسلامی ناگ ہمیں ڈس لے گا۔ اس لئے آج وعدہ کرو کہ اس زہریلے ناگ کا فن کچلنے میں سب ایک دوسرے کی مدد کریں اور وقت کے پٹارے میں اس طرح بند کریں کہ اسے جب جہاں چاہیں، اپنے بین پر نچا سکیں۔''

پمپلیٹ پڑھتے ہی ماں کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئیں۔ بیٹے نے کچھ دیر تک ماں کے چہرے پر آتے جاتے رنگ کو دیکھا اور پھر بولا۔

''کیا لکھا ہے ماں ـــــ؟''

''کچھ بھی نہیں.....بس اتنا جان لو کہ دنیا کے ہر موڑ پر نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہیں جو ہاتھ میں کٹار لئے کھڑے ہیں۔ لیکن ہم بھی بے حیا پودے کی طرح ہیں۔ جتنا کاٹیں گے اتنی تیزی سے ہماری شاخیں پھیلیں گی۔ ہمیں ختم کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔''

کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ ماں سے زیادہ بیٹے کے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ خوف سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

''کیا وہ لوگ ہمیں بھی کاٹ دیں گے.....؟''

''نہیں میرے لال! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہم لوگ آج راتوں رات یہاں سے بھاگ چلیں گے۔ وہ جو دور ایک گاؤں دکھائی دیتا ہے نا۔ وہاں کافی مسلمان ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر ہم لڑیں گے۔ اپنی جان دے دیں گے۔ لیکن پٹارے میں بند ہو کر اس کے اشارے پر گلی گلی ناچ نہیں دکھائیں گے۔''

ماں کی باتیں سن کر بیٹے کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ چار پائی کے نیچے سے ہوائی چپّل پہنتے ہوئے بولا۔

''تو اچھا ماں، اب تم رکو.... میں تھوڑا پانڈے سر کے گھر جاتا ہوں۔ ان کے بیٹے کے پاس میری پٹاخے والی بندوق دیوالی سے پڑی ہوئی ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔؟''

ماں اسے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن وہ تیزی سے بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ اپنی بندوق کمر میں کھونسے، سینہ تانے گھر کے اندر داخل ہوتا ہے۔ ماں جو اس کے انتظار میں بے چین تھیں۔ سینے سے لگا لیتی ہیں اور چوم چوم کر گال سرخ کر دیتی ہیں۔''

اس روز ماں شام سے ہی دوسرے گاؤں جانے کی تیاری میں جٹی ہوئی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، اس کے لئے انہوں نے شام سے ہی دروازہ بند کر رکھا تھا۔ بیٹے کو کہیں باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ جلدی کھانا کھلا کر سُلا دیا تھا ـــــ وضو کر کے پہلے نماز پڑھیں۔ دیر تک دعائیں مانگیں۔ پھر کلام پاک کی تلاوت میں جُٹ گئیں۔ دل کو جب سکون ملا تب وہ بستر پر دراز ہو گئیں۔

آدھی رات ہوتے ہی جب انہیں لگا کہ گاؤں والے سو گئے ہیں، تب وہ اپنے بیٹے کو جگا کر چند ضروری سامان اور زیورات کی پوٹلی لے کر پیچھے کے دروازے سے چوروں کی طرح نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہو کر خود کو دوسرے گاؤں کی طرف چھپتے چھپاتے

لے جانے لگیں۔

آسمان میں بادل تھے۔ بادل نے مسکراتے چاند کو نگل لیا تھا۔ ہوا تیز تھی۔ کھیتوں میں لگی فصلیں ہواؤں کے زور کے آگے جھکی جا رہی تھیں۔ دونوں اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر جانی پہچانی پگڈنڈیوں پر بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں ہوا تھا کہ بادل بے وفا کے طرح بیچ سے سرک گیا..... یکایک پیچھے سے چور چور کی آواز اُبھری اور قریب ہوتی چلی گئی۔ دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ پھر چھپنے کی۔ لیکن پیچھے سے آتی ہوئی بھیڑ نے چاندنی کا فائدہ اٹھا کر گنّے کے کھیت سے دونوں کو ڈھونڈ نکالا۔

''ارے یہ کوئی چور نہیں ملی چھنی با ـــــ'' ایک نے چلّا کر کہا۔

''ماردے ماں بیٹا دونوں کو۔ لگتا ہے گاؤں چھوڑ کر جا رہی ہے سالی۔'' دوسرے نے کہا۔

تیسرے نے ڈنڈا مارنا شروع کیا۔ ابھی دونوں کو دو دو ڈنڈے ہی لگے تھے کہ زمین میں گر گئے۔ بیٹا بے ہوش ہو گیا۔

''نہیں، نہیں رکو ـــــ!'' پانڈے نے لاٹھی چلانے والے کا ہاتھ تھام لیا۔ مارنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پوچھ کر دیکھنے میں کیا بُرائی ہے اگر انکار کرتی ہے تو سالی کو یہیں کھیت میں کھود کر گاڑ دیں گے۔''

بھیڑ چاروں طرف سے ماں بیٹے کو گھیرے ہوئے تھی۔ ماں بے ہوش بیٹے کے سامنے ہونّق کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ پانڈے ان کے سامنے لاٹھی لئے کھڑا تھا۔

''دیکھو گڈو کی ماں۔ وقت بہت کم ہے اور ہم تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔ تمہارا ماسٹر پتی بھی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مارا گیا تھا..... ہندوستان، ہندوؤں کا استھان ہے۔ یہاں ملیچھوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں زندہ رہنا ہے تو ہندو دھرم کو اپنانا ہوگا۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو میرے لوگ تمہیں ننگا کر کے تیرے بیٹے کے سامنے وہ سب کریں گے جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتی۔''

سینکڑوں لوگوں کے درمیان گھری ماں اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹائے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ بیٹا کچھ کچھ ہوش میں آ گیا تھا۔ ماں کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا

کریں۔لیکن ایک بات بار باران کے ذہن میں گونج رہی تھی کہ کسی بھی طرح بیٹے کو کافروں سے بچایا جائے۔بعد میں دیکھا جائے گا جو ہوگا۔

بہت دیر تک وہ کچھ نہیں بولیں تو پانڈے نے بیٹے کے اوپر ایک ڈنڈا رکھ دیا۔وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ماں چلاّ اُٹھیں۔

''اسے مت مارو۔تم جیسا کہو گے میں ویسا کرنے کے لئے تیّار رہوں۔'' ماں پانڈے کے پیروں پر گر کر گڑ گڑانے لگیں۔

''اگر تم شُدّھی کرن کے لئے تیّار ہو تو پھر تم ہماری حفاظت میں ہو۔ایک ہفتہ تک تم شُدّھی کرن کیمپ میں رہو گی۔ شُدّھی کرن کے بعد تمہارا اویواہ کسی ایسے آدمی سے کر دیا جائے گا جس کی بیوی سورگ سدھار گئی ہو۔وہ تمہارے بیٹے کو بھی اپنا لے گا۔''

''کوئی یہاں ہے،جو شُدّھی کرن کے اپرانت اسے اپنائے گا۔؟''ایک نے آواز لگائی۔

بھیڑ میں سے ایک ادھیڑ عمر کا گنجا بڑی سی توند لئے آگے بڑھا اور پانڈے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ——'' شری مان!ہمری نجر تو کب سے گڈّو کی مائی پر گڑی ہوئی تھی۔بھلا ہو شُدّھی کرن کا شری مان۔شُدّھی کرن کے دن اگر آپ کہیں تو شادی کا جوڑا اور پنڈت جی کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں۔؟''

''نہیں لاؤ گے تو کوئی دوسرا ہاتھ مار لے گا۔'' ایک نے اس کے گنجے سر پر زور سے چپت لگائی۔

دوسرے نے اس کی توند کو سہلاتے ہوئے عورت سے کہا۔'' ٹھیک سے دیکھ لو۔بعد میں مت کہنا کہ توند نہیں ہے۔کھاتے پیتے گھر کا ہے۔تمہیں بھی خوب کھلائے گا۔''

'' کچھ بھی کٹا نہیں ہے۔سب کچھ پورا ہے۔دیکھنا تمہیں بھی پورا ہی کھلائے گا۔''

سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے......

پانڈے کے کہنے پر ایک نے بے ہوش بچّے کو گود میں اُٹھالیا۔کئی لوگ عورت اور بچّے کو کیمپ تک پہنچانے گئے۔وہ گنجا توند والا بھی وہاں تک گیا اور دربان کو سمجھا بجھا کر سب کے ساتھ لوٹ گیا کیمپ میں پہلے سے جوان،بوڑھے،مرد عورت موجود تھے۔سب پر گہری نگرانی

رکھی جارہی تھی۔ کیمپ کو چاروں طرف سے کٹیلی جھاڑیوں اور کٹیلے تاروں سے گھیرا گیا تھا۔

تیسرے دن ہولی تھی ـــــ

اس دن سارے گاؤں میں ملیچھوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ بھگوان کو خوش کرنے کے لئے اس کے پاس اس سے اچّھا کوئی دوسرا موقع نہیں تھا ـــــ بچ وہ گئے جو موت کے خوف سے شُدّھی کرن کے لئے راضی ہو گئے تھے۔ سبھوں کو شُدّھی کرن کیمپ لایا گیا۔ یہاں بھی زعفرانی جھنڈے لہرا رہے تھے۔

شُدّھی کرن کی پہلی رات......

یہ ملیچھوں کے لئے آخری رات تھی۔ کل اس کا شُدّھی کرن کیا جانا تھا۔ سب کے سب اپنی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بھاگنے کے جب سارے راستے بند ہو گئے تو مقتل گاہ میں سب نے اپنا اپنا سر جھکا دیا کہ زندگی رہی تو کافروں سے نپٹا جائے گا۔

دوسری طرف اسی رات دھرم پری ورتن سنگٹھن کے ادھیکچھ کو خوشی سے نیند نہیں آرہی تھی کہ صبح ہوتے ہی صدیوں کا سپنا ساکار ہونے والا تھا......وہ کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ مذہب کی فلسفیانہ گفتگو میں اپنے ہمزاد سے اُلجھ گئے۔ کہ وہ کون ہیں۔؟ کہاں سے آئے ہیں۔؟ اس کے پُروج کس مذہب کے تھے۔؟ دنیا کا پہلا مذہب کون سا ہے۔؟ رات بھر وہ اسی طرح سوالوں میں الجھے رہے۔ لیکن جب کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تو ان کی حالت پاگلوں جیسی ہو کر رہ گئی۔

آخر کار رات کا اندھیرا چھٹا اور شُدّھی کرن کا سورج طلوع ہو گیا ـــــ

منچ پر زعفرانی جھنڈے لئے لوگ جلوہ افروز تھے۔ پانڈے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں ملیچھ دو زانو بیٹھے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں زعفرانی جھنڈے تھے۔ گنجا سر پر نقلی بال اُگائے، شادی کا جوڑا پہنے پنڈت جی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

اسی دوران پانڈے مائک کے سامنے آ گیا ـــــ

''بہنو اور بھائیو! اب وہ گھڑی آ چکی ہے۔ جس کا ہمیں صدیوں سے انتظار تھا۔

ملیچھ یا تو مارے گئے ہیں یا کچھ ہی دیر میں اس کی اشُدھ آتما شُدّھی کرن کی آگ میں جل کر ختم ہو جانے والی ہے۔''

''.....اور اب میں دھرم پری ورتن سنگٹھن کے ادھیکچھ مہودے سے آگرہ کرتا ہوں کہ وہ ڈائس پر آئیں اور ایک ملیچھ کو اپنے شُبھ ہاتھوں سے شُدّھی کرن کر کے اس شُبھ اوسر کو یادگار بنائیں۔''

ادھیکچھ مہودے ہاتھ جوڑے مائک کے سامنے آئے ـــــ

''بہنو اور بھائیو! رات بھر دھرم پری ورتن کے سمبندھ میں گہن ادھیّن کے اُپرانت میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دھرتی پر جب بھی پہلی بار ایک پروش اور استری کا آگمن ہوا ہوگا تو اس وقت اس کا کوئی مذہب نہیں رہا ہوگا.....انسان کا انسان سے ملن پر اگر کوئی مذہب بنا ہوگا تو وہ مذہب 'انسانیت ' کا ہوگا۔ اور یہی دنیا کا سب سے پُرانا مذہب رہا ہوگا۔ ایسے ہندو دھرم بھی بہت پرانا ہے۔

''دوستو!''

اب وہ شُبھ گھڑی آگئی ہے۔ میں شُدّھی کرن کے لئے ایک ایسی عورت کو آواز دے رہا ہوں جس کے پتی کو دھرم کے نام پر دس سال پہلے میں نے اسی خنجر سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔'' کمر سے دھاردار تر شول نما خنجر نکال کر ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے آگے کہا۔'' آج اس کی پتنی کی باری ہے۔ وہ جلد سے جلد منچ پر آئے۔''

عورت کو منچ پر آتے دیکھ کر مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پانڈے مسکرا رہا تھا ـــــ پھر یکا یک ایک زوردار ہوا کا جھونکا آیا اور منچ کی شان بڑھاتا زعفرانی جھنڈا زمین پر آگرا۔ پانڈے اور پانڈے جیسے لوگوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

مجمع مبارکباد دینے کے لئے منچ پر ٹوٹ پڑا۔

فوٹوگرافروں نے کیمرہ سنبھال لیا۔

....کیوں کہ سنگٹھن کے ادھیکچھ نے عورت کے ہاتھوں خود اپنا شُدّھی کرن کروا لیا تھا۔

☆

کسان کے اجزائے ترکیبی

۱/ دسمبر ۲۰۰۷ء
جمشید پور۔۱۰
مدیر اعلیٰ —— ! آداب،

آپ کا محبّت نامہ ملا۔ لیکن افسوس کہ حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ ایک حادثے نے مجھے بستر پر پہنچا دیا ہے۔ کچھ لکھ پانا مشکل ہے۔ ویسے ذہن میں کئی موضوعات ہیں۔ لیکن فرمائش کے باوجود ڈرتا ہوں کہ کہیں مہینوں خون جلاؤں اور آپ جیسے مدیر اسے ردّی کی نظر نہ کر دیں۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ کسی موضوع کو افسانوی فارمیٹ میں فٹ کرنے سے پہلے 'اجزائے ترکیبی' پر آپ سے رائے مشورہ کر لوں۔

موضوع

نکسل واڑی سے دنتے واڑہ تک......نام چھوڑئے ہندوستان کا ہر وہ حصّہ میرے افسانے کا موضوع ہو سکتا ہے، جہاں کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ ظلم و استحصال ہوا ہو۔ استحصال کرنے والے کون ہیں۔؟ اور کس کس طرح سے استحصال کرتے ہیں، اُسے ہی موضوعِ بحث بنایا جانا ہے۔ جو بظاہر تو کسانوں اور مزدوروں کے ہمدرد نظر آتے ہیں۔ لیکن پسِ پردہ

وہ کیا کررہے ہوتے ہیں یہ آپ کو تب پتہ چلے گا جب اس موضوع پر میں کوئی پلاٹ ترتیب دوں گا۔

پلاٹ

اسے تیّار کرنے کے لئے میں نے کئی راتیں گنوائی ہیں۔لیکن بنے بنائے فارمولے کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے افسانے کے چوکھٹے میں اس طرح فٹ کروں کہ 'شاہکار' ہوجائے۔لیکن اب تک جس طرح کا پلاٹ بن پایا ہے اس پر افسانے کی فلک بوس عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی۔ پھر بھی پلاٹ آپ کو بتاتا ہوں۔

سرکار ایک کمپنی کو ہزاروں ایکڑ زمین لیز پر دیتی ہے،اس زمین پر کئی گاؤں آباد ہیں اور گاؤں میں کئی ہزار کسان۔کسانوں کو گاؤں چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کے لئے کہا جاتا ہے۔اپوزیشن جو برسوں سے سرکار کو گھیرنے کی تاک میں ہوتی ہے،اسے بیٹھے بٹھائے مُدّا مل جاتا ہے۔ وہ آئندہ انتخاب میں اسے کیش کرانا چاہتی ہے۔اس لئے وہ کسانوں کو اکساتی ہے۔اس سے بھی جب کام نہیں چلتا تو وہ اپنے لوگوں کو ہتھیار دے کر کسانوں پر گولیاں چلواتی ہے۔کسان سرکار کے اس ظالمانہ رویّے کے خلاف جوابی کارروائی کے لئے میدان میں کود پڑتے ہیں۔فوج اپنے بچاؤ میں اندھادھند گولیاں چلاتی ہے۔ ہر طرف کسانوں کی لاشیں نظر آتی ہیں۔پورا علاقہ چھاؤنی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔تب لال گلیارے سے کسانوں کے بھیس میں بندوق بردار نمودار ہوتے ہیں اور اپوزیشن کے ساتھ مورچہ سنبھال لیتے ہیں۔ پھر ہر جگہ روڈ جام، ہڑتال،توڑ پھوڑ اور گھیراؤ شروع ہوجاتا ہے۔اس پر اسمبلی میں خوب ہنگامہ ہوتا ہے —— پھر آخر میں الیکشن ہوتا ہے۔اپوزیشن اقتدار میں آجاتی ہے۔کسان پھولے نہیں سماتے ہیں۔سرکار کمپنی سے زمین واپس لے لیتی ہے۔لیکن نئی سرکار اپنے وفادار کسانوں کو کس طرح زمین لوٹاتی ہے۔ان کے احسانوں کا بدلہ کس طرح چکاتی ہے۔اس کے بارے میں ابھی پوری طرح سے میں نے کچھ سوچا نہیں ہے۔لیکن ہمیشہ کی طرح مجھے اُمیّد ہے کہ جیسے جیسے افسانہ لکھتا جاؤں گا ویسے ویسے کچھ اور نئی باتیں جڑتی چلی جائیں گی۔ میں نے جو باتیں کہی ہیں وہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو افسانے میں دکھائی نہ دے۔اور جو دکھائی

دے وہ ہوسکتا ہے بتائی ہوئی باتوں سے ذرا الگ ہوں۔ فی الحال پلاٹ ادھورا ہے۔ کلائمکس کیا ہونا چاہئے ابھی اس پر غور وفکر جاری ہے۔ اس لئے آپ کو مطمئن نہیں کرسکتا ـــــ اب جب کہ یہ ادھورا پلاٹ آپ سن چکے ہیں تو یہ صرف میرا نہیں رہا، آپ کا بھی ہوگیا۔ اس پلاٹ کو مکمّل کرنے کی ذمہ داری جتنی میری ہے اتنی آپ کی بھی۔ آپ بھی سوچیں اور بتائیں کہ آگے کیا ہونا چاہئے۔؟ تب تک میں کردار کی تلاش میں نکلتا ہوں۔

کردار

میرے افسانے میں کئی کردار ہوسکتے ہیں۔ کمپنی، سرکار، اپوزیشن، نکسلائٹ اور کسان وغیرہ..... مجھے اُمیّد ہے کہ ان کرداروں سے آپ پہلے بھی کہیں نہ کہیں مل چکے ہوں گے۔ پھر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ تاکہ جب افسانہ آپ کو بھیجوں تو کرداروں کے ساتھ ناآشنائی نہ رہے۔

کمپنی ـــــ نئی ریاست کی تشکیل کے بعد جب اسے لگتا ہے کہ متحدّہ ریاست کی سہولتوں سے محروم کردیا جائے گا۔ نئی پالیسی کے تحت اس پر ٹیکسوں کے شکنجے روز بہ روز کستے چلے جائیں گے اور آخر کار کئی کمپنیوں کی طرح ایک دن اسے بھی بند کردینا پڑے گا، تب کمپنی کے ڈائریکٹر اعلیٰ افسروں سے کمپنی کو دوسری ریاست میں منتقل کرنے کا منشاء ظاہر کرتے ہیں کہ وہاں کی سرکار اُسے پانچ سو ایکڑ زمین دینے کے لئے تیّار ہے اور وہ ساری سہولیات جو متحدّہ ریاست میں ہمیں مل رہی تھیں اس کے علاوہ بھی بہت ساری نئی مراعات دینے کا وعدہ متصّل ریاست کرچکی ہے۔ اس لئے جلد سے جلد کمپنی کو یہاں سے شفٹ کردی جائے۔ تاکہ طرح طرح کے ٹیکسوں سے بچ سکیں۔ پھر کم سے کم قیمت پر وہاں غریب مزدور مل جائیں گے۔ کچّا مال بھی آسانی سے دستیاب ہوجائے گا۔ اس طرح کم لاگت میں مال تیّار کرکے ہم دنیا کی منڈی میں اپنی پکڑ مضبوط کرسکتے ہیں۔ اس وقت افسروں کے پیسے بھی دُگنے اور تین گنے ہوجائیں گے۔

سرکار ـــــ کمپنی کو زمین دینے کے پیچھے اس کا یہ منصوبہ تھا کہ ٹیکس کے

علاوہ مزدوروں کو نوکری مل جائے گی۔ سڑک بجلی، پانی اور اعلیٰ تعلیم سے وہ سب بھی فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ زمین کے عوض انہیں موٹی رقم مل جائے گی۔ راتوں رات ان کا اِسٹیٹس بھی ہائی ہو جائے گا۔ اور ہم چناؤ کے دوران اس مُدّے کو ریاستی سطح سے جوڑ کر اچھا خاصا ووٹ بینک قائم کر لیں گے ـــــ لیکن اپوزیشن اس مُدے پر کسانوں کو ورغلا کر اس کی مخالفت میں کھڑا کر دیتی ہے۔ سرکار کمپنی کی حفاظت میں اپنا سارا دم خم لگا دیتی ہے کسانوں کا احتجاج بڑھتا جاتا ہے۔ سرکار احتجاجیوں کے خلاف فوج اُتار دیتی ہے۔ آگ اور بھڑک اُٹھتی ہے۔ چاروں طرف گاؤں جلنے لگتے ہیں۔ فوجی بھی مارے جاتے ہیں ـــــ سرکار خود کو بچانے کی انتھک کوشش کرتی ہے۔ لیکن 'کمپنی' سے پیچھے ہٹنے کا مطلب اس کی 'سیاسی موت' ہے۔ اب سرکار کی نظر میں کسان، کسان نہیں بلکہ 'اپوزیشن' ہے۔ اس لئے وہ صرف اتنا چاہتی ہے کہ اس آگ اور دھواں کے درمیان کسی طرح سے بھی بس ایک بار 'کمپنی' کی تشکیل ہو جائے تو وہ ریاستی ترقّی کے جال میں لوگوں کو پھانس کر لالچ کا ایسا 'شہد' چٹائیں گے کہ اس کے اندر کی ساری 'کڑواہٹ' ایک پل میں ختم ہو جائے گی..... پھر اپوزیشن کا کیا ہے۔؟ اسے جب چاہیں گے کمپنی کی بھٹّی میں جھونک دیں گے۔

اپوزیشن ـــــ اسے اس بات کا اندیشہ ستاتا ہے کہ کمپنی کی آمد سے جہاں کسانوں کی زندگی میں بہتری آئے گی وہیں سرکار اسے ترقّی کا مُدّا بنا کر الیکشن میں اس کا فائدہ اُٹھائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ کسانوں کو اُکسا کر ہنگامہ کھڑا کیا جائے۔ وہ مکھیا اور سرپنچ کو ایم ایل اے بنانے کا جھانسہ دیتی ہے۔ اپنے لوگوں کو بھیڑ میں شامل کر کے کسانوں پر گولیاں چلواتی ہے اور یہ افواہ پھیلاتی ہے کہ ظالم سرکار نہتّے غریب کسانوں کا بربریّت سے خون کر رہی ہے۔ کسان ڈر کے مارے پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلتے ہیں۔ اپوزیشن ان کے آنسوؤں کو پوچھنے کے لئے بانس ترپال وغیرہ دے کر عارضی رہائش کا انتظام کرواتی ہے۔ کسانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ملک گیر شہرت یافتہ رہنُماؤں کو بلایا جاتا ہے۔ ان کے قدم بھی اُکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ اپوزیشن ہاتھ کھینچتی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ

کسانوں کے ان ہاتھوں میں جہاں لاٹھیاں ہوا کرتی تھیں، وہاں اب ہتّھیار ہیں لیکن سرکار کے خلاف انتخابی جنگ جیتنے کی خواہش میں اپوزیشن یہ جاننا بھول جاتی ہے کہ جن کسانوں کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے اناج تک نہیں تھا، راتوں رات کون سا ایسا جادو ہو گیا کہ وہ ہتّھیاروں سے لیس ہو گئے۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی مصلحتاً اپوزیشن خاموش رہتی ہے کہ جدید ہتّھیاروں سے لیس کسان کوئی بھی ہوں، پسِ پردہ وہ آخر ان کا ہی ساتھ دے رہے ہیں۔

نکسلائٹ ــــ سرکار کے نکسل مخالف قانون کی وجہ سے نکسلیوں کو کئی ریاستوں میں جھٹکے لگ چکے ہوتے ہیں۔ دوبارا جنم بھومی میں وہ اپنے پاؤں جمانا چاہتے ہیں۔ نکسل واڑی کی یاد تازہ کرتے ہوئے وہ پہلے بندوق کی زنگ آلود نال صاف کرتے ہیں اور پھر اپوزیشن کی شہ پر کسانوں کا بھیس بدل کر سرکار کے خلاف گوریلا یُدھ چھیڑ دیتے ہیں۔ کئی سرکاری افسر مارے جاتے ہیں۔ کئی کو بندھک بنا لیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں سرکاری کام چل رہا ہوتا ہے، وہاں وہاں لال جھنڈے گاڑ دئے جاتے ہیں۔ چھانچ چھوٹا کرنے کا پوسٹر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ چھاؤنیوں پر گرینیڈ سے حملہ کیا جاتا ہے۔ سڑکوں میں مائنس بچھائی جاتی ہے ۔ پٹریاں اُکھاڑی جاتی ہیں۔ ٹرین کو بم سے اُڑایا جاتا ہے تا کہ سرکار کے اندر دہشت پیدا کر کے سیاست میں اپنی ساکھ مضبوط کی جائے ــــ الیکشن کے بعد اس میں سے کئی لوگ حکومت میں بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

کسان ــــ جب پہلی بار گاؤں کا مکھیا کمپنی کھلنے کی خوشخبری کسانوں کو دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ زمین کے بدلے سب کو پیسہ ملے گا اور ہر گھر کے ایک آدمی کو اس کی قابلیت کے مطابق نوکری بھی ملے گی تو سارے کسان خوشی کے مارے ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے کہ اب انہیں تپتی دوپہری میں اپنے جسم کو جلانا نہیں پڑے گا۔ بارش، سیلاب، طوفان اور سوکھے کی موسمی مار جھیلنا نہیں پڑے گی۔ اِدھر مہینہ ختم ہوا اور اُدھر تنخواہ جیب میں۔ ان کے بچّے بھی سج دھج کر اچھے اسکولوں میں جا سکیں گے۔ ڈاکٹر انجینئر بن سکیں گے۔ لیکن

کچھ ہی دنوں میں ان کے یہ خواب اس وقت بکھر جاتے ہیں جب ٹکٹ کے لالچ میں اپوزیشن کے اشارے پر سرپنچ اور مکھیا کسانوں کو بھڑکاتے ہیں کہ سرکار ہمیں زمین کے پیسے دے گی اور نہ کام ہی۔ اگر مزدوری کے لئے مجبوراً بلاتی بھی ہے تو آدھی تنخواہ فنڈ کے نام پر کمپنی اپنے کھاتے میں جمع کر لے گی۔ جو ریٹائرمنٹ کے بعد ہی مل پائے گی۔ ریٹائرمنٹ تک مزدور زندہ کہاں رہتا ہے۔؟ سارے پیسے کمپنی ہڑپ کر جائے گی۔ اس کے بعد ''کمپنی بھگاؤ، زمین بچاؤ'' کا نعرہ چاروں طرف گونجنے لگتا ہے ـــــ آخر الیکشن ہوتا ہے۔ نتیجے کے اعلان کے بعد کسانوں کو اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ ان کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ سرپنچ اور مکھیا کی مدد سے وہ اب دوبارہ اپنے گاؤں لوٹ سکیں گے۔

مکالمے

''وہ کسان لیڈر جو ہمارے خلاف آگ اُگل رہے ہیں، انہیں خرید لو تا کہ زرخرید غلام کی طرح دُم ہلاتے پھریں۔''

کمپنی

''ہمارے خلاف آواز اُٹھانے والوں کے لئے ایک ایسا قانون بناؤ کہ مخالفت کرنے والوں کی زندگی جیل کی نذر ہو جائے۔''

سرکار

''پونجی پتیوں کی اس سرکار کے لئے جتنی جلدی ہو سکے سیاسی قبر تیار کر لو تا کہ ہم سب مل کر اس کی لاش کو سڑنے سے پہلے اس میں دفن کر سکیں''

اپوزیشن

''جہاں سرکار اور اپوزیشن آمنے سامنے ہوں، وہاں غیر پسندیدہ سرکار سے بیتے زخموں کا حساب کرنے میں زیادہ وقت مت لگاؤ۔ اپوزیشن کے اندر گھس کر گھر گھر لال سلام پہنچاؤ اور سیاست میں اپنی پکڑ مضبوط کر و تا کہ حکومت ہمارے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن جائے۔''

نکسلائٹ

''اگر سرکار زمین نہیں لوٹاتی ہے تو ہم لال گلیارہ تک جائیں گے۔
جان دے دیں گے کہ یہی ہماری پہچان ہے **کسان**

کلائمکس

الیکشن میں سرکار کی شکست ہوتی ہے۔اپوزیشن اقتدار میں آجاتی ہے۔کسان خوشی خوشی گاؤں لوٹنے کے لئے جب پرتولنے لگتے ہیں تب سرکاری رپورٹ آجاتی ہے کہ گولی، بم اور دھماکے کی وجہ سے اب وہ جگہ انسانوں کے لئے زہر آلود اور کاشت کے لئے بے کار ہو چکی ہے۔پھر سرکار کسانوں سے ہمدردی دکھاتی ہے اور ان کی رہائش کا مستقل انتظام دوسری جگہ کر دیتی ہے ـــــ آخر میں کسانوں کو نقصان نہ ہو اس کی بھرپائی کے لئے نئی سرکار اس 'بے کار زمین' کو ملٹی نیشنل کمپنی کے حوالے کر کے اتنی رقم جتنی گذشتہ سرکار دے رہی تھی، کسانوں کو دے کر اپنی واہ واہی لوٹتی ہے۔

☆

برادرم!

آپ کو یہ باور کرادوں کہ جو 'اجزائے ترکیبی' چھوٹ گئے ہوں گے، انہیں لکھتے وقت شامل کر لئے جائیں گے..... باقی جہاں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہوگی آپ اُس کی نشاندہی کریں گے تاکہ فرمائش پوری کرسکوں۔

خدا کرے آپ شگفتہ ہوں۔

آپ کا

الف الف

☆

وہیل چیئر والی لڑکی

''آئی جی ایم سی، شملہ کے ٹروما وارڈ میں میرا استر ہواں دن تھا۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ آرتھو اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم وارڈ میں داخل ہوئی۔ میں بیڈ نمبر سات میں لیٹا ہوا تھا۔ ترتیب وار مریضوں کو دیکھنے کے بعد جب ڈاکٹروں کی ٹیم میرے پاس آئی تو ڈاکٹر لوکیش ٹھاکر مجھے دیکھتے ہی مسکرائے۔

آج فرائیڈے ہے۔ گڈ فرائیڈے۔ بولو فرائیڈے کے دن ڈسچارج ہونا کیسا رہے گا۔ گڈ رہے گا نا۔؟''

میں اس سے پہلے کہ کچھ کہتا۔ انہوں نے آگے کہا۔ ''ڈاکٹر علی! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ گھر میں آپ اور بھی بہتر محسوس کریں گے۔ فارملٹیز پوری ہوتے ہی ڈسچارج پیپر آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔''

ڈسچارج کے نام پر میں اندر سے کانپ گیا .....

ڈاکٹروں کی ٹیم باقی مریضوں کو دیکھ کر وارڈ سے باہر نکل گئی۔ تمام اٹینڈینٹ وارڈ میں آ گئے۔ میری صبا اسٹول پر آ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اداس دیکھ کر کہنے لگی۔

''کیا کہا ڈاکٹر نے.....؟''

میں خاموش رہا——

''آپ نے چھٹّی کے لئے ان سے بات کی یا نہیں۔؟''

''نہیں ـــــ! لیکن حیرت ہے کہ پھر بھی انہوں نے مجھے ڈسچارج کر دیا۔''

''ڈسچارج۔'' وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ ''اجی چھٹّی کے نام پر آپ کو خوش ہونا چاہئے۔ بہتوں کو اسپتال سے جانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہم لوگ خوش نصیب ہیں کہ گھر لوٹ رہے ہیں۔''

''لیکن میرے لئے کیا گھر کیا اسپتال۔ جب ٹھیک سے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تو پھر گھر جانے کا فائدہ.....؟ سوچتا ہوں کہ یہاں کچھ دن اور رُک کر اچّھے سے اپنا علاج کراؤں۔''

صبا سے یہ سب کچھ میں نے کہہ دیا۔ لیکن اصلیّت سے واقف ہوں کہ میری ٹانگ کا جتنا علاج ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ اسپتال میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن کچھ دن اور میں رہنا چاہتا تھا۔ بیڈ نمبر پانچ کے سامنے۔ اور اس وقت بھی میری نظریں بیڈ کے خالی بستر پر کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس دوران صبا کو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ مجھے گھر کے مخملی بستر سے زیادہ خوبصورت ہسپتال کی بے رنگ چادر کیوں لگ رہی ہے۔ اس لئے اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ بھر گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں تیزابیت بھی تھی اور شہد کی مٹھاس بھی۔ کچھ ہی دیر بعد تیزابیت ختم ہو گئی۔ مٹھاس سامنے چلی آئی۔ پھر میرے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی بیڈ نمبر پانچ کے خالی بستر پر کسی کو ڈھونڈنے لگیں۔

آج صبح ہی سازینہ کو لیڈیز وارڈ میں منتقل کیا گیا تھا۔ میری ایک ٹانگ کا آپریشن ہوا تھا۔ اور اس کی دونوں ٹانگوں میں اسٹیل راڈ لگا ہوا تھا۔ کمر کی ہڈّی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ میرا اور اس کا بیڈ بالکل آمنے سامنے تھا۔ بہ مشکل آٹھ دس فٹ کا فاصلہ رہا ہو گا۔ پندرہ دن تک وہ میرے ساتھ رہی۔ لیکن اس دوران کسی طرح کی حرکت کرتے ہوئے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ جسم کمبلوں سے ڈھکا رہتا۔ سر اور ہاتھ کبھی ایک طرف سے باہر نظر آتے تو کبھی دوسری طرف سے اسٹیل راڈ سے سجے دونوں پاؤں کمبل سے جھانکتے دکھائی پڑتے۔ چہرہ

میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

اس وارڈ میں دس بیڈ تھے۔نمبر ایک پر ایل آئی سی ایجنٹ تھا۔جس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔وزن دے کر بیڈ پر سیدھا رکھا گیا تھا۔کبھی کبھی درد سے بلبلا اٹھتا تھا اور وزن ہٹانے کے لئے چیخا کرتا تھا ـــــ نمبر دو پر ایک بیس بائیس سال کا لڑکا تھا۔جو چونا گردانی کا کام کرتا تھا۔سہ منزلہ عمارت کی باہری دیواروں پر رنگ وروغن کے دوران بانس سے سلپ کر گیا۔ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔فکسیٹر کے بعد جب پلاسٹر کیا گیا تو ہڈّی کی سوراخوں میں پیپ بھر گیا تھا۔وہ رات دن چیختا رہتا تھا ـــــ نمبر تین پر ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔اس کی بہو کسی نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔لیکن لڑکی کے گھر والوں نے الزام لگایا کہ جہیز کی خاطر ساس نے بہو کو مار کر کہیں پھینک دیا ہے۔اسے خوب مارا۔پورے جسم میں چوٹ تھی۔جگہ جگہ پلاسٹر لگا ہوا تھا۔ہمیشہ کراہتی رہتی تھی ـــــ چار نمبر بیڈ پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔سیب پیڑ کی کٹنگ کے دوران توازن برقرار نہیں رکھ پایا اور گر گیا۔ریڑھ اور پیر کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔پیشاب کے لئے پائپ لگا ہوا تھا۔کبھی کبھی تھیلی میں پیشاب کے ساتھ خون بھی آجاتا۔تب وہ خوب کراہتا ـــــ چھ نمبر میں ایک بیس سال کا نوجوان تھا۔ہلکی داڑھی تھی اس کی۔وہ ڈرائیور تھا۔لاہول اسپیتی میں برف باری کے دوران اس کی کار قریب سوفٹ نیچے کھائی میں گر گئی تھی۔اس کے دائیں ہاتھ اور کاندھے کی ہڈّیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔سر بھی بری طرح سے زخمی تھا۔اسے ڈاکٹر نیند کی دوا دے کر رکھتے تھے۔اس لئے وہ ہمیشہ سویا رہتا تھا ـــــ آٹھ نمبر میں شملہ یونیورسیٹی کے شعبۂ قانون کا ایک اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔اس کے جسم کی ہڈّی قدرتی طور پر نہایت نرم تھی۔زور سے انگلی دباتے ہی دھنس جاتی تھی۔یوں ہی آتے جاتے چلتے پھرتے دس بارہ فیکچر ہو چکے تھے۔دونوں پیروں میں اسٹیل راڈ لگے ہوئے تھے۔اس بار جب کمر کے ٹھیک نیچے فیکچر ہوا تو ڈاکٹروں نے اسٹیل پلیٹ لگوانے کا ہمیشہ کی طرح مشورہ دیا۔اس وقت وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگا تھا کہ ''ساری زندگی اسے وہیل چیئر پر ہی کیوں نہ رہنا پڑے لیکن اب وہ آپریشن نہیں کروائے گا'' ـــــ نو نمبر پر ایک نیپالی مزدور لیٹا رہتا تھا۔منالی میں سڑک بنانے کے دوران ایک چٹّان اوپر سے سرک گئی اور وہ اس کی زد

میں آ گیا۔ دونوں ہاتھ، ایک پیر اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ ہو گئی۔ کھانا بھی وہ خود کھا نہیں سکتا تھا ۔ اسپتال کی صفائی کرنے والے اس کا خیال رکھتے۔ دو تین گھنٹے کے لئے وہیل چیئر پر اسے دھوپ میں لے جا کر بٹھاتے۔ دو سال سے وہ اسی بیڈ پر تھا۔ ریڈ کراس نے اس کے علاج کا خرچ اُٹھا رکھا تھا۔ اس کی بیوی اس حادثے کے بعد اس کے دوست کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ ایک ماں تھی وہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے غم میں مر گئی ہے۔ رشتہ داروں نے بھی کوئی کھوج خبر نہیں لی۔ اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو کہاں جائے گا۔؟ یہ سوچ کر وہ اکثر رونے لگتا تھا ـــــ نمبر دس کا مزدور سُرنگ میں کام کرتا تھا۔ پہاڑ کاٹنے کے لئے ڈائنامائیٹ کا استعمال کر رہا تھا۔ مِس ٹائمنگ ہوئی۔ وہ پلیتہ نکالنے گیا۔ بدقسمتی یہ کہ کھینچتے ہی پھٹ گیا۔ ہاتھ کی ساری انگلیاں دھماکے کی نظر ہو گئیں۔ اور وہ دونوں ہاتھ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جب بھی کوئی اس سے ملنے کے لئے آتا وہ اپنے دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں کو کمبل میں چھپا لیتا۔ لیکن پھر نہ جانے اسے کیا ہو جاتا کہ وہ بے قابو ہو جاتا۔ دونوں ہاتھ سامنے رکھ دیتا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ ''بھگوان نے مجھے کھانے کے لائق بھی نہیں چھوڑا۔ اب میرے پریوار کا کیا ہوگا۔؟ لگتا ہے کہ جان دے دوں۔''

بیڈ نمبر پانچ کی سازینہ کو اس رات فیور تھا۔ ریڈیو میرے پاس تھا۔ میں کمبل کے اندر دھیمی آواز میں کمنٹری سُن رہا تھا۔ رات کے ایک بجے ہوں گے۔ اچانک کھڑکی کھلنے کی آواز ہوئی۔ اور ہوا کا ایک تیز جھونکا سرد ہواؤں کو بانہوں میں سمیٹے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے کمبل سے سر باہر نکالا۔ نمبر دس کا مریض جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے، کھڑکی پر پاؤں رکھ کر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ ابھی اس سے کچھ کہتا یا کسی کو اُٹھاتا کہ اس سے پہلے وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ کھڑکی کی دوسری جانب کود گیا۔ قریب چالیس فٹ نیچے۔ یہ رات بہت بھیانک تھی۔ کبھی سوچتا ہوں تو میری روح کانپ اُٹھتی ہے۔

وارڈ کے ان مریضوں کو دیکھنے کے بعد مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا غم تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی وہ احساس تھا جس نے میری صحت کے راستے ہموار کئے اور بہت جلد بیساکھی

میرے کاندھے کے نیچے جھول گئی۔ اور اب میں ضرورت کے وقت خود کو باتھ روم تک لے جانے لگا تھا۔

سازینہ کی دیکھ بھال کے لئے اس کی چھوٹی بہن ارم اس کے پاس تھی، تو میری صبا میرے ساتھ۔ ایک دو دن میں ہی دونوں کے درمیان اچھی دوستی ہوگئی۔ دونوں مل کر دوا اور ضرورت کے ساری چیزیں خریدا کرتیں۔ اس بہانے وہ دونوں مال روڈ کی سیر بھی کر لیا کرتیں۔

ارم دن میں کئی بار خیریت پوچھنے میرے پاس آتی۔ گھنٹوں خوش گپّیاں کیا کرتی۔ وہ قانون کی پڑھائی کر رہی تھی۔ بہترین پینٹنگ بھی بنایا کرتی تھی۔ لٹریچر کا بھی اسے تھوڑا بہت شوق تھا۔ اکثر وہ مجھ سے کہانی لکھنے کے گُر پوچھا کرتی۔ بدلے میں قانونی داؤں پیچ، وکیلوں اور مجرموں کے دلچسپ قصّے اور پینٹنگ کی باریکیاں بتایا کرتی۔ بات ہی بات میں اکثر کہتی ـــــ ''باجی اور آپ کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا'' سازینہ کے متعلّق کبھی کبھی وہ ایسی ویسی باتیں بھی بتا جاتی، جسے شاید اسے بتانا نہیں چاہئے تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ بات کی رو میں بہہ جاتی۔ میں بھی مزے لے کر سنتا رہتا اور چاہتا کہ وہ جب تک پاس رہے سازینہ کی ہی باتیں کرتی رہے، تاکہ اس کی ذات کو مرکز بنا کر میں ایک خوبصورت کہانی کی بنیاد رکھ سکوں۔

سازینہ کے بارے میں ارم نے جو کچھ کہا تھا۔ اس کے مطابق شملہ کی خوبصورت لڑکیاں بھی اس کے آگے ماند پڑ سکتی تھیں۔ وہ شملہ کے ہی ایک انگلش اسکول میں ٹیچر تھی۔ لیکن اس دن بدقسمتی اس کے ساتھ ساتھ گھر سے اسکول تک آئی تھی اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ تیسری منزل پر وہ کلاس لے رہی تھی۔ پڑھانے کے دوران اسے کھانسی آئی۔ کھانستے ہوئے وہ کھڑکی تک گئی۔ کھڑکی سے قریب ڈھائی فٹ نیچے چھجّہ تھا۔ جہاں پودوں کے آٹھ دس گملے رکھے ہوئے تھے۔ ایک گملا گرا ہوا تھا۔ بلغم تھوکنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر گملا سیدھا کرنا چاہا۔ عین اسی وقت ایک اور زوردار کھانسی آ گئی۔ چپّل کی اونچی ایڑی سلپ ہوگئی۔ جسم کا توازن کیا بگڑا۔ وہ سیدھے بغیر جالی والی کھڑکی سے قریب پچیس فٹ

نیچے گر گئی۔ خوش قسمتی یہ کہ سانس کا رشتہ نہیں ٹوٹا۔ لیکن ریڑھ اور پیر کی دونوں ہڈیاں اس کے جسم کا وزن برداشت نہیں کر سکیں۔ وہ بیڈ سے چپک گئی۔

صبا جب بھی سازینہ کے پاس سے لوٹتی اس کی آنکھیں بھیگی ہوتیں۔ اکثر وہ اس کی باتیں کیا کرتی ——— بے چاری کا اب کیا ہوگا۔؟ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ چلنا تو دور، آپریشن کے بعد اگر بیٹھ پائی تو یہ اس کی قسمت۔ کچھ ہی مہینے کے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔ لیکن اس کا وہ محبوب جسے اس کے بغیر ایک پل بھی چین نہیں تھا، حادثے کے فوراً بعد روپوش ہو گیا۔ اور اب وہ اس کی ایک سہیلی میں انٹرسٹ لینے لگا ہے۔ اب تو ساری زندگی اس کیلئے عذاب ہو گئی ہے۔'' اس طرح کی کئی اور باتیں صبا کو کچوکے لگاتیں۔ میں اسے سمجھاتا کہ زندگی دھوپ چھاؤں ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل بہلانے کے لئے مذاق بھی کرتا جاتا کہ ''محترمہ! میری بھی ایک ٹانگ میں کمپاؤنڈ فیکچر ہے اور اسٹیل راڈ لگا ہوا ہے۔ لیکن تمہیں بے چاری کا غم زیادہ کھا رہا ہے۔ اس لئے جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ میں تیار رہوں۔ باضابطہ نکاح کروں گا۔ یہیں اور اسی بیڈ پر۔ پھر دیکھنا کیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی بغیر آپریشن کے ٹھیک ہو جاتی ہے۔''

میرے ہاتھ پکڑنے کے باوجود اس نے اسی وقت سازینہ کے کان میں وہ سب کچھ کہہ دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری شریف بیوی شرافت کا ایسا نظارہ مذاق میں دکھائے گی کہ میں چہرہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔ صبا کی بات سن کر وہ مسکرانے لگی تھی۔ بولی۔

''اگر زندگی بھر اس اپاہج کی خدمت کے لئے تیار رہیں تو مجھے بھی آپ کی سوتن بننے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' صبا کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ اداس ہو گئی۔ آہستے سے بولی۔ ''صبا! اب مجھ جیسی اپاہج سے شادی تو دور کی بات ہے، وقت گزاری والی محبّت بھی کوئی نہیں کرے گا۔''

ہسپتال میں دن تو جیسے تیسے گذر جاتا۔ لیکن مریضوں کے لئے رات اصل امتحان کی گھڑی ہوتی۔ جتنا گہرا زخم، اتنی گہری رات۔ بے چین اور کروٹ بدلنے والی۔ جب

سارے اٹینڈ ینٹ سو جاتے تب میری صبا میرے بیڈ کے دائیں طرف فرش پر کمبل بچھا کر دن بھر کی تھکاوٹ نکالتی۔ قریب دس بجے تک ساری لائٹیں بند کر دی جاتیں۔ لیکن کھڑکیوں اور دروازوں کے اوپر لگے شیشے سے باہر کی روشنی کسی ضدّی بچّے کی طرح کود کر اندر آ جاتی اور اندھیرے میں چھپنے کی کوشش کرتی۔ میں بھی اس مدھّم روشنی میں آدھی رات تک ٹانگوں کو سنبھالتا رہتا۔ فکسیٹر پر کسی چیز کا دباؤ نہ پڑ جائے۔ اس کا خیال رکھتا۔ کبھی اس کوشش میں ناکام ہوتا تو ایک درد کی لہر میری شریانوں میں دوڑ جاتی۔ صبا اٹھ کر فوراً پیر سہلانے لگتی۔

عالمی کرکٹ مقابلہ جاری تھا۔ اپنی ٹیم بنگلہ دیش جیسی کمزور ٹیم سے ہار چکی تھی۔ اس کے باوجود رات گذاری کے لئے کمنٹری سننے کا خواہاں تھا۔ اس کا ذکر میں نے چھوٹے بھائی سے کیا۔ اُدھر وہ بازار گیا۔ اور اِدھر صبا نے ریڈیو آنے کی خبر ریڈیو آنے سے قبل سازینہ کے سامنے نشر کر دی۔

شام کے سات بجتے بجتے ریڈیو آ گیا۔ چھوٹے بھائی نے ابھی اس کا آن آف اور بینڈ سسٹم بتایا ہی تھا کہ ارم چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے سامنے آ گئی۔

''صبا صاحبہ! باجی ریڈیو دیکھنے کے لئے مانگ رہی ہیں۔''

صبا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر ریڈیو ارم کے حوالے کر دیا۔ اِدھر ہم لوگ کھانا کھانے میں مشغول ہوئے اور اُدھر سازینہ ایف ایم پر نغمے سننے لگی۔ رات دس بجے لائٹ آف ہونے سے قبل صبا نے کہا۔ ''لگتا ہے گانا سنتے سنتے وہ سو گئی ہے۔'' لیکن جب سینے پر رکھے ریڈیو کو اُٹھانے لگی تو جھٹ سے اس نے صبا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بڑی معصومیت سے بولی۔ ''پلیز! آج میرے پاس ہی رہنے دیجئے۔'' صبا لوٹ آئی۔ میں نے بھی اس سے کچھ نہیں کہا۔

ان دنوں نیند رات بھر میری آنکھوں سے دور رہتی۔ رات بھر میں کروٹیں بدلتا رہتا۔ زخمی پاؤں سنبھالتا رہتا۔ لیکن اس رات وارڈ میں ایسا لگ رہا تھا جیسے رات کی شہزادی اپنے پیروں میں مدھر گیت کے پازیب پہنے چھن چھن ناچ رہی ہے۔ درد کا احساس جاتا رہا۔ مجھے سو جانا چاہئے تھا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ پاؤں کا درد بڑھے۔ میں رات بھر کروٹ

بدلوں۔ اور رات بھر گیت سنتا رہوں۔ لیکن اس رات نہ ہی پاؤں کا درد بڑھا اور نہ ہی میری آنکھ لگی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ارم ریڈیو لے کر آئی اور بولی۔ ''باجی نے سر کو تھینکس کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ دن بھر ریڈیو آپ سنیں اور رات کے لئے مجھے دے دیں۔'' اس پر صبا نے کہا۔ ''نہیں رات میں سر کمنٹری سنیں گے۔'' اس وقت تک مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ گذشتہ رات اپنی ٹیم سری لنکا سے میچ ہار چکی ہے۔ '' ایسا ہے کہ انڈیا ٹیم ولڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ سے باہر ہو چکی ہے۔ اب کمنٹری میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔'' اس وقت صبا مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی عادت کے خلاف میں نے انہونی بات جو کہہ دی تھی۔

پھر روز کا یہی معمول ہو گیا۔ شام ہوتے ہی ریڈیو سازینہ کے پاس چلے جاتا اور صبح ناشتے کے بعد وہ میرے بیڈ پر پہنچ جاتا۔ اب رات بھر میرے اندر جاگنے کا عمل جاری رہتا۔ اس لئے دن میں سونا ضروری ہو گیا۔ صبا اور ارم اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھی اپنی اپنی کہانیاں سُنایا کرتیں۔ اس دن ارم میرے بیڈ سے لگ کر بیٹھی تھی۔ دونوں باتیں کر رہی تھی۔ اور پھر دونوں کی باتیں دھیرے دھیرے میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ میں نے آنکھیں اور زور سے موند لیں۔ اور اسی طرح گھنٹوں دونوں کی بے تکی باتیں سنتا رہا۔ لیکن ایک بات پر مجھے ہنسی آ گئی اور میری چوری پکڑی گئی تھی۔ جب اِرم نے یہ کہا۔ ''باجی کہہ رہی تھیں کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ اس حال میں بھی اتنے بڑے رائٹر کے ساتھ ہوں۔''

اس دن میں نے اپنے پبلیشر کو فون کر کے اپنی کہانیوں کا مجموعہ منگوایا۔ صبا نے کہا۔ ''ایک آپ ڈاکٹر صاحب کو دینے والے ہیں۔ دوسرا کس کو دیں گے۔؟'' میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ''بغیر دیکھے، بغیر پڑھے وہ آپ کو عظیم رائٹر سمجھتی ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں بتاؤں گی کہ آپ کتنے وہ ہیں۔'' پھر کچھ رک کر۔ ''اگر آپ کسی اور کو دینے کے لئے منگوائے ہیں تب بھی میں یہ اُسے ہی دوں گی۔ جب وہ آپ کی جنس زدہ کہانیاں پڑھے گی تب دیکھئے گا آپ کی ساری اِمیج کیسے ٹوٹتی ہے۔''

''اچھا ـــــ لیکن ایک بات جان لو۔ اگر کسی باحیا عورت کو کسی مرد کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس سے جڑی اس کی کسی بھی چیز سے جنسیّت جھلکتی ہے، تو جانتی ہو اس سے بچنے کے لئے وہ جس حیا کا جتنا سہارا لے گی، وہی اسے اس مرد سے اتنا قریب کر دے گی۔'' میں مسکرانے لگا تھا۔

''آپ اپنی فلاسفی اپنے پاس رکھیں ۔ وہ آپ جیسے کلوٹھے پر مرنے والی نہیں ہے۔؟ اگر ٹھیک ہو گئی تو ہزاروں مریں گے اس پر.....'' صبا نے چڑھانے کے انداز میں کہا۔

سازینہ اس دن ذرا بھی نہیں سوئی۔ دن بھر کہانیاں پڑھتی رہی۔ سونے سے قبل ارم نے بتایا۔ ''باجی آپ کی کافی تعریف کر رہی ہیں کہ جیسا میں نے سوچا تھا اس سے کہیں اچّھی کہانیاں لکھتے ہیں آپ۔''

اکثر ہم دونوں کے درمیان پھلوں کا تبادلہ ہوتا۔ اخبار بھی ایک ہی لئے جاتے۔ سرنج، دوائیاں، ٹیپ، روئی، بینڈ یز اور دستانے ضرورتاً ایک دوسرے سے بدلے جاتے۔ نرس کو جس وقت جس چیز کی ضرورت ہوتی بغیر پوچھے مسکراتے ہوئے اُٹھا لیتی۔ اور کسی کو اس حرکت پر اعتراض نہیں ہوتا۔ وارڈ کے لوگ بھی حیرت سے دیکھتے رہتے۔

ڈسچارج کے دن صبح کا ٹمپریچر لینے کے لئے جب نرس وارڈ میں آئی تو اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر بعد سازینہ کو دوسرے وارڈ میں شفٹ کر دیا جانا ہے۔ اس وقت میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اسے دوسرے وارڈ میں کیوں منتقل کیا جا رہا ہے۔؟ یہیں رہنے دیا جائے۔ نہیں تو مجھے بھی وہاں شفٹ کیا جائے۔ میرے کہنے پر صبا اور ارم ڈاکٹر کے پاس گئیں، ڈاکٹر نے خوب کھری کھوٹی سنائی۔ دونوں منہ لٹکا کر لوٹ آئیں۔

دونوں کے پیچھے پیچھے دو وارڈ بوائے اسٹریچر لئے آ گئے۔ پانچ سات منٹ کے اندر ہی سازینہ کا بیڈ میری آنکھوں کے سامنے شفٹ کر دیا گیا۔ اس وقت سازینہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جب اسے لے جایا جا رہا تھا تب صبا نے دھیرے سے کہا تھا اسے

دیکھئے گا کہ وہ کتنی خوبصورت ہے۔'' اسٹریچر ٹھیک میرے بیڈ کے پاس آ کر رک گئی۔ صبا نے کہا۔ ''سازینہ جا رہی ہے''۔ لیکن اس وقت میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں ۔ دیکھنے کی ہمّت مجھ میں نہیں تھی۔ جب تک اسٹریچر رُکی رہی ۔ میری سانسیں بھی رُکی رہیں۔ صبا اس کو چھوڑنے وارڈ تک گئی۔ جب لوٹی تو غصّے سے بولی۔

''آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔؟ بے چاری دو تین منٹ رُکی رہی، اور آپ اپنی آنکھیں بند کئے سونے کا ناٹک کرتے رہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔''

''کیا ـــــ؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہ تو نہیں معلوم۔ لیکن جب میں لوٹ رہی تھی تو اس نے کہا تھا کہ رائٹر صاحب سے کہئے گا کہ ان کی ایک فین ان سے صرف ایک بار ملنا چاہتی ہے۔''

اس وقت میں اندر سے بہت اداس تھا۔ پھر بھی اپنی عادت سے مجبور تھا۔ صبا کو چھیڑنے سے باز نہیں آیا ـــــ '' جا کر کہہ دینا کہ کمر جب تک سیدھی نہ ہو تب تک ملنے کا کیا فائدہ....؟''

صبا نے مذاق ہی مذاق میں مذاق کی وہ باتیں سازینہ کو بتا دیں۔ تھوڑی دیر بعد ارم میرے پاس آئی اور بولی۔ ''صبا نے باجی سے کچھ ایسا کہہ دیا ہے کے وہ مسلسل روئے جا رہی ہیں ۔ کچھ بتا بھی نہیں رہی ہیں۔ صرف اتنا کہہ رہی ہیں کہ میں ان سے صرف اس لئے ملنا چاہتی تھی کہ انہیں اپنی دکھ بھری کہانی سناؤں، تاکہ وہ میری کہانی لکھ سکیں .....لیکن اب مجھے ان سے نہیں ملنا ہے۔ رائٹر بڑے ہیں تو ہوا کریں۔''

اسی دن گڈ فرائیڈے تھا۔ میری چھٹّی ہو چکی تھی۔ میں اداس تھا۔ لیکن صبا بہت خوش تھی۔ سامان جب وہ سمیٹ چکی تو ڈسچارج سلپ لینے کے لئے ڈاکٹر کے پاس گئی۔ وہیں سے اس نے ہسپتال کے باہر سے کار ٹھیک کر لی۔ پھر وہ سیدھے سازینہ کے پاس گئی اور اپنی خوشی نہیں روک پائی۔

''سازینہ سر کی چھٹّی ہو گئی ہے۔ ہم لوگ جا رہے ہیں۔ ارم تم سازینہ کا خیال رکھنا

۔اچّھا باہر کار لگی ہوئی ہے۔گڈ بائی۔پھر ملیں گے۔'' کہہ کر صبا میرے پاس آ گئی۔اور وارڈ کے لوگوں سے مل کر دونوں ہاتھ میں بیگ اُٹھائے باہر نکل گئی۔میں بھی بیساکھی کے سہارے خود کو ایک ٹانگ پر گھسیٹتا ہوا اسپتال کے صدر دروزے تک پہنچ گیا۔سامنے کار کھڑی تھی۔ ڈرائیور ڈِگّی میں سامان رکھ رہا تھا۔ارم دوڑتے ہوئے کار کے پاس آ گئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

''صبا ایک منٹ رکنا۔سازینہ باجی آ رہے ہیں۔''

''لیکن کیسے.....؟ وہ تو اُٹھ بھی نہیں سکتی۔؟''

''یہی تو حیرت ہے کہ اس جاں لیوا درد میں بھی کمر بیلٹ باندھ کر وہیل چیئر پر سہارے سے بیٹھ گئی ہیں ۔بس آپ لوگ ابھی رکئے۔میں باجی کو لے کر آتی ہوں۔''

اِدھر اِرم سازینہ کو لانے کے لئے بھاگی اور اُدھر گارڈ نے ڈرائیور کو دھمکا کر گاڑی آگے بڑھوادی۔ڈرائیور نے آگے جا کر گاڑی کنارے لگائی۔صبا باہر نکل کر سازینہ کا انتظار کرنے لگی۔ڈرائیور ہوا خوری کے لئے باہر نکلا۔اِرم ہانپتے ہوئے وہیل چیئر لے کر کار تک آئی ـــــ لیکن اس وقت تک میں سب سے نظریں بچا کر لنگڑاتا ہوا پچھلی سیٹ سے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔پھر کار اِسٹارٹ ہو گئی اور سامنے سے آتی ہوئی گاڑی سے ٹکرا گئی۔

اس حادثہ کو ہوئے ایک عرصہ گذر گیا ہے۔اُس وہیل چیئر پر اب میں بیٹھا ہوں اور یہیں سے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے اُترتے اُسے دیکھتا رہتا ہوں۔

☆

ریموٹ کنٹرول

بریکنگ نیوز.....

''ملک کے سب سے اہم شہر کے اہم مقامات پر سینکڑوں خودکش بم باروں نے ایک ساتھ کئی اہم دھماکے کئے۔جس میں ہزاروں بے گناہ انسان مارے گئے.....ابھی تک کسی دہشت گرد تنظیم نے اس کی ذمہ داری نہیں لی ہے۔''

اعلیٰ کمان یہ سنتے ہی خوشی کے مارے اپنی سیٹ سے اُچھل پڑا۔یکا یک خودکش تربیت گاہ میں خودکش تربیت یافتہ نوجوانوں کی بھیڑ اُمڑ آئی۔اورسب کے سب گلے مل کر ایک دوسرے کومبارکباد دینے لگے۔

پھر سب چیف کمانڈر کے استقبال کی تیاری میں جُٹ گئے۔

اِدھر جشن کی تیاری چل رہی تھی اور اُدھر چیف کمانڈر اپنے اس کامیاب آپریشن کو اور بھی کامیاب بنانے میں مشغول تھا۔جشن گاہ تک پہنچنے اور اعلیٰ کمان کو سرپرائز دینے کے لئے وہ پاگلوں کی طرح بیتاب تھا۔

اور بھلا بے تاب کیوں نہ ہوتا کہ اس نے اپنی مرضی سے خودکش تنظیم کی رکنیت قبول کی تھی۔اس تنظیم سے وابستہ وہ ایک مقصد کے تحت ہوا تھا کیوں کہ اس کے ساتھ ماضی میں گھنونا سلوک ہوا تھا۔وہ اپنے حریفوں سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔اوراس مقصد میں اسے

کامیابی بھی ملی۔

کبھی وہ سائنٹسٹ اور ملک کا باعزّت شہری تھا۔لیکن عالمی سطح پر مذہبی دہشت گردی کے پیمانے جیسے جیسے مخصوص ہوتے گئے ۔اس پر بھی شک کا گاڑ کرتا گیا.....اور ایک دن ملک کی خاطر اپنی پوری زندگی وقف کرنے والے اس وفادار شخص پر دہشت گردی کا لیبل چپکا دیا گیا۔لیکن اس سے پہلے کہ پولس اسے اپنے قبضے میں کرپاتی وہ کسی طرح سے تجربہ گاہ سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا۔

پھر وہ بھاگتے بھاگتے رُکا تو خودکش تنظیم کی تربیّت گاہ میں اعلیٰ کمان کے سامنے خودکو کھڑا پایا۔

''کون ہوتم ؟ یہاں کیوں آئے ہو؟ایک مہذب شخص کو اپنے سامنے حواس باختہ دیکھ کر اعلیٰ کمان حیران تھا۔

''میں ایک انسان ہوں۔برسوں سے میرے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا آیا ہے۔ویسے میں پیشے سے سائنٹسٹ ہوں۔لیکن ایک مخصوص قوم کے ہونے کے ناطے مجھ پر دہشت گرد ہونے کا جُرم ثابت ہو چکا ہے۔دنیا کی تمام اہم لیبارٹریز کی رپورٹیں میرے خلاف ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی بم دھماکے ہو رہے ہیں۔وہاں میرے ہی فارمولے کام میں آرہے ہیں۔میں دہشت گرد کا دوست اور غدّارِ وطن ہوں....ایک دن اپنے ایک کلی گ کو پولس کے ساتھ سازش رچتے ہوئے میں نے سُن لیا ۔اس سے پہلے کہ پولس حوالات میں قید کرتی،عدالت عمر قید یا پھانسی کی سزا سُناتی۔میں نے اس جونیئر سائنٹسٹ کو جو اپنی ترقّی کی راہ میں مجھے رکاوٹ سمجھ رہا تھا،گلا دبا کر کام تمام کر دیا ۔اگر ایسا نہیں کرتا تو یقین مانیئے وہ مجھے بھاگنے نہیں دیتا۔میں یا تو پکڑا جاتا یا اِنکاؤنٹر میں مارا جاتا۔''

''یعنی تم قاتل ہو.....؟''

''نہیں،میں آج بھی سائنٹسٹ ہوں۔قاتل تو وہ ہے جس نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا۔میں تو اپنے ملک کے لئے کام کرنا چاہتا تھا۔لیکن اب.....؟''اس کی آنکھوں سے

آنسورواں تھے۔

''اب تم چاہ کربھی ملک کے لئے کام نہیں کر سکتے۔اگر کام کرنا ہی ہے تو میرے لئے کرو۔تمہیں یہاں اپنے جوہر کودکھانے کا بھرپور موقع ملے گا۔مجھے تم جیسے ہی کسی آدمی کی تلاش تھی۔جوجائے واردات پر بم بنا کرخودکش بمباروں کے حوالے کر سکے ۔'' اعلیٰ کمان نے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگالیا۔

سائنٹسٹ کے اندر دوسروں کے خلاف نفرت پہلے سے موجود تھی۔کچھ اور ہوا اس کے دل کے بلاڈر میں دہشت گردی کے پمپ سے بھردی گئی۔پھر اصول وضوابط سمجھائے گئے کہ'' ٹارگیٹ ہمارا دشمن کوختم کرنا ہے۔دشمن کوختم کرنے میں کبھی خود کوبھی ختم کرنے کی ضرورت پڑی تو بھی پیچھے نہیں ہٹنا کہ دنیا میں اس سے بڑی کوئی جیت نہیں۔کیوں کہ ہم جب خودکو مارنے پرآجاتے ہیں تب دوسروں کو مارنا آسان ہوجاتا ہے۔لیکن ہمیں ناکامی وہاں ملتی ہے جب ہم خود سے پیار کرنے لگتے ہیں ـــــ بیوی بچّوں کی یاد کبھی دل میں مت لانا۔انہیں وقت پر پیسے ملتے رہیں گے۔اوراگرکبھی غلطی سے بھی تم نے خاندانی رشتے اِستوار کرنے کی کوشش کی تو بےموت مارے جاؤگے۔ ''

عہدنامہ پر دستخط کرنے کوتو اس نے کردیا۔لیکن بار بار بیوی اور تین سالہ بیٹی کا خوبصورت چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔جسے دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں اور بھی بےچین تھیں۔اس نے چپکے سےفون پر بیوی سے رابطہ قائم کیا۔اورا سے یقین دلایا کہ ماحول سازگار ہوتے ہی وہ اسے اپنے پاس بلالے گا۔

اعلیٰ کمان خودکش تنظیم کی بنیادکواور مضبوط و مستحکم کرنے کی خواہش میں اکثر ان ممالک کی سیر کیا کرتا۔جہاں کےلوگ یا توغریب تھے یا جہاں کےلوگوں کودوسرے ممالک نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔یا پھر ویسے مذہبی نوجوان جوکسی بھی قیمت پر اپنے خلاف ایک بھی لفظ سُننا نہیں چاہتے تھے۔انہیں غریبی سے نکالنےاورآزادانہ زندگی جینے کے خواب

دکھا کر اعلیٰ کمان ڈالروں میں تول لیتا اور خودکش کی ٹریننگ دے کر ضرورت مند تنظیموں اور ملکوں کے ساتھ سودے بازی کرتا۔ اور دنیا کے مختلف حصّوں میں بھیج کر ایسی تباہی مچاتا کہ دنیا حیرت زدہ رہ جاتی۔

اس کے اس کارنامے کو دیکھ کر ایک پریس رپورٹر نے اعلیٰ کمان سے پوچھا تھا ''کہ آپ دہشت گردی کے بجائے دنیا میں امن وامان کیوں نہیں پھیلانا چاہتے۔۔؟'' اس کے جواب میں اس نے کہا تھا۔ ''میں دہشت گردی نہیں، ان نوجوانوں کو روزگار دیتا ہوں، جسے سرکار نکمّا سمجھتی ہے۔ دہشت کی وجہ سے سرکار لاکھوں فوجیوں کو سرحد پر تعینات کرتی ہے۔ اگر دہشت گردی ختم ہوگئی تو سرحدوں پر تعینات یہ فوجی کہاں جائیں گے۔؟ کل ہوکر یہ بھی بے روزگاروں کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔ اصل دہشت گرد ہم نہیں سرکار ہے۔ جو سفید کھدّر میں دہشت گردی کرتی رہتی ہے۔ جسے نہ کبھی آپ کی آنکھیں دیکھ پاتی ہیں اور نہ ہی آپ کا قلم پکڑ پاتا ہے۔ پکڑے ہم جاتے ہیں۔ لیکن اب ہمیں پکڑنا اتنا آسان نہیں۔ کیوں کہ اب ہمیں ایک ایسا چیف کمانڈر مل گیا ہے جو کسی بھی طرح کے دھماکے کو منٹوں میں انجام دے سکتا ہے۔''

چیف کمانڈر کی خفیہ ٹریننگ اعلیٰ کمان کی نگرانی میں قریب سال بھر چلتی رہی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس کی مدد سے ملک بھر میں سلسلہ وار دھماکے کرنے میں کامیاب ہوجائے گا، تب اس نے اسے نقشہ فراہم کیا اور دھماکے سے جڑی اشیاء کی فراہمی فوری طور پر کروانے کی یقین دہانی کی۔

چیف کمانڈر ملک کے سب سے اہم میٹروپولی ٹن سیٹی کے ایک پوش کالونی میں اپنا حلیہ تبدیل کر کے رہنے لگا۔ ایک سال تک وہیں رہا۔ یوں تو دکھاوے کے لئے اس نے ایک طرح کا بزنس کر رکھا تھا۔ لیکن ہر وقت وہ اپنے مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بزنس کی آڑ میں اِدھر اُدھر گھوما کرتا۔ اور اس درمیان وہ اعلیٰ کمان کے بھیجے ہوئے تربیت یافتہ خودکش بمباروں سے الگ الگ مقامات پر نقشے کے مطابق ملتا بھی رہتا۔ ساتھ ہی ساتھ بم

بلاسٹ کے لئے اس کے ذہن کو مضبوط بھی کرتا رہتا۔

اس دوران خفیہ راستوں سے بم سازی کے سارے سامان چیف کمانڈر تک پہنچ گئے۔ اس نے بڑی احتیاط اور جان کو جوکھم میں ڈال کر سینکڑوں بم تیّار کئے اور خود کش بمباروں کے حوالے کر مخصوص مقامات تک بھیجوا دیئے۔

بلاسٹ کے دوسرے دن وہ اعلیٰ کمان سے بچ کر دوسرے ملک نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی نئی زندگی کی شروعات کے لئے نام بدل کر اپنا فرضی پاسپورٹ اور ویزا بھی بنوالیا تھا۔

طے شُدہ پروگرام کے مطابق سینکڑوں خود کش بم باروں نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ کسی نے ٹرین میں جگہ بنائی۔ کسی نے بھری بس میں، کسی نے بازار میں اپنی پوزیشن لی، تو کسی نے فلم ہال میں، کسی نے بھیڑ بھاڑ والے پارک کو نشانہ بنایا تو کسی نے ٹورسٹ پلیس کو ،کسی نے کھچا کھچ بھرے اسٹیڈیم کو حدف بنایا تو کسی نے تاج کو، اوبرائے کو۔ سی ایس ٹی کو ،تو کسی نے نریمن ہاؤس کو......یعنی ہر وہ جگہ جہاں انسانوں کا جمِ غفیر تھا، وہاں خود کش بم بار موجود تھے۔

چیف کمانڈر نے سوچا کہ کسی ایک خود کش بمبار کے ساتھ وہ بھی جائے واردات پر جائے اور اپنی آنکھوں سے اپنی کرشمہ سازی دیکھے.....ایک کے ساتھ وہ اسٹیشن تک گیا۔ طے شدہ وقت پر جو ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگی اس میں اس کو سوار کر کے وہ خود پلیٹ فارم کی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ بم دھماکے کے لئے جو وقت مقرّر تھا اس میں ابھی پانچ منٹ کا وقت تھا۔ اور ابھی ابھی جو ٹرین آئی تھی اور جس میں خود کش بمبار سوار ہوا تھا وہ صرف پانچ منٹ کے لئے یہاں رکتی تھی۔ پروگرام کے مطابق ٹرین چلنے کے ایک منٹ کے بعد خود کش بمبار کو دھماکہ کر دینا تھا۔

ٹرین چل پڑی۔ قریب بیس پچیس سکنڈ تک پٹریوں پر رینگنے کے بعد اس میں تھوڑی تیزی آ گئی تھی۔ ابھی اس کے سامنے سے دو بوگی ہی پار ہوئی تھی اور وہ ہر اس مسافر کو جو کھڑکی سے نظر آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں اسے الوداع کہہ رہا تھا کہ یکا یک تیسری بوگی

کی کھڑکی کی سلاخوں سے کھیلتی ہوئی ایک بچّی پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی آنکھوں کو دھوکہ ہوا ہے۔ لیکن جب ٹرین کی رفتار کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس نے ایک بار غور سے دیکھا تو پھول سی بچّی کے پیچھے اسے ایک اور پھول سا چہرہ نظر آیا۔ سر سے پیر تک ایک زوردار کرنٹ اسے لگا اور اس کا دماغ یکا یک فیوز ہو گیا۔ بم پھٹنے سے پہلے ہی اس کے کانوں میں گرم گرم شیشہ پگھلنے لگا۔ دھواں پھیلنے سے قبل آنکھوں کے سامنے کا سارا منظر دھواں دھواں ہو گیا اور آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

شہر کے سینکڑوں متعدّد مقامات پر ایک ہی وقت میں خودکش بمباروں کے ذریعہ کئے گئے انسان سوز حادثے میں ہزاروں زندگیاں موت میں بدل گئیں۔ اسپتال زخمیوں سے بھر گئے۔ شہر ماتم کدہ بن گیا۔

اپنے لوگوں کی تلاش میں ملک کے کونے کونے سے لوگ وہاں ٹوٹ پڑے۔ اسپتال میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ کئی اسکولوں اور کالجوں کو اسپتال میں تبدیل کر دیا گیا تھا.....لوگوں کی اس بھیڑ میں چیف کمانڈر بھی شامل تھا۔ بڑی مشکل سے جلی بھنی لاشوں کے ڈھیر سے وہ ایک پانچ سالہ بچّی اور تیس سالہ عورت کی شناخت کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے کہ تھمتے نہیں تھم رہے تھے۔ اس نے آواز بدل کر پولس کی طرف سے گھر والوں کو فون کیا تاکہ آخری رسومات کی ادائیگی بروقت ہو سکے۔

پھر آنکھوں میں آنسو چھپائے وہ سیدھے وہاں سے خودکش تربیت گاہ کی طرف چل پڑا۔ راستہ بھر دونوں کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

بم بلاسٹ کے بعد وہ ملک سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دوسرے دن کی فلائٹ میں اس نے اپنا اور بیوی بچّے کا ٹکٹ بھی بُک کروا رکھا تھا.....لیکن بیوی جو سالوں سے دور رہی تھی اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھی۔ اور پھر جب اس کا فون آیا تو اس نے سوچا کہ ایک دن پہلے پہنچ کر وہ اپنے شوہر کو سرپرائز دے گی۔ جس اسٹیشن پر یہ حادثہ ہوا

تھا اس کے بعد والے اسٹیشن پر اُسے اُترنا تھا۔ لیکن اُترنے سے پہلے ہی اس کی زندگی کی ٹرین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وقت کی پٹری سے اُتر گئی۔

بریکنگ نیوز کے ختم ہوتے ہی سبھی چیف کمانڈر کے انتظار میں نظریں بچھائے بیٹھے تھے۔ آدھی رات سو رہی تھی اور آدھی مسلسل جاگ رہی تھی کہ تبھی چور دروازے نے چیف کمانڈر کے جشن گاہ میں آنے کی اِطّلاع دی۔ پوری رات جھوم اُٹھی۔ سبھی کے چہرے مسکراہٹوں سے کھل اُٹھے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان پھولوں سے اس کا استقبال کیا گیا۔ پھر ایک ایک کر کے تمام خودکش تربیت یافتہ نوجوان اس سے گلے ملے اور اس ہاتھ کو چومتے رہے، جس نے دنیا کے سب سے بڑے سلسلے وار دھماکے کو انجام دیا تھا۔

اسی جشن گاہ میں چیف کمانڈر کے شانوں پر خودکش تنظیم کا سب سے بڑا تمغہ لگنے والا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ کمان کی باگ ڈور بھی اسے سونپی جانی تھی.....اعلیٰ کمان نے اس کے شانوں پر جیسے ہی تمغہ لگایا، اس کے چہرے پر ایک معنیٰ خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے سب سے پہلے خودکش تربیت گاہ پر ایک نظر ڈالی۔ پھر تربیت یافتہ نوجوانوں کے چہرے کو غور سے پڑھا اور آخر میں اعلیٰ کمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں آج بہت خوش ہوں کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔ لیکن ساری پلاننگ تو آپ کی تھی۔ میں تو صرف آپ کے حکم کا مہرہ تھا۔ اس لئے ہزاروں انسانوں کی روحوں سے جڑے اس تمغے کا اصل حق دار تو تم ہوا اعلیٰ کمان !

تمغہ منہ پر پھینکا اور کمر میں بندھے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔

پہلی آزادی

''اے محبوب ترین شخص! ہم آپ سے صرف اپنے بیٹے زید کی آزادی چاہتے ہیں۔اس کے لئے جس قدر رفدیہ آپ چاہیں، ہم ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔''

غُلامی کی دھرتی پر ہی آزادی کا بیج بویا جاتا ہے۔وہیں پودا نکلتا ہے۔کلی کھلتی ہے۔ پھر پھول بنتا ہے۔لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہماری دھرتی پر آزادی کا پھول کھلنا ابھی باقی تھا.....لوٹ مار، قتل و غارت گری، زنا اور شراب نوشی بالکل عام سی بات تھی۔انسان کی خرید و فروخت کو بھی بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا۔اس لئے انسانی بازار میں زید بھی بک گیا تھا۔

زید آٹھ سال کا تھا۔خوبصورت اور تندرست۔ذہانت ان کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔وہ اس دن اپنی ماں کے ساتھ تھا۔اور ماں قافلے کے ساتھ۔اور قافلہ گھاٹی سے ہو کر گذر رہا تھا۔قافلہ ابھی گھاٹی کی پریشانیوں اور صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے کچھ آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔اس سے پہلے کہ وہ سب کے سب سنبھلتے، ڈاکو لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔لیکن جاتے جاتے ڈاکو سامان کے ساتھ معصوم اور ہنس مُکھ زید کو بھی اُٹھا کر لے گئے۔کمزور ماں ڈاکوؤں کے نام سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔کچھ دیر کے بعد لوگوں نے جب ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آئیں۔ہوش میں آتے ہی بے چین آنکھوں سے انہوں نے

پہلے زید کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنا چاہا۔ پھر لوگوں کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھا اور زور زور سے رونے لگیں۔

''ہائے میرا زید..... ہائے میرا نورِ نظر.....ڈاکوا سے بھی لے گئے.....آہ میری دنیا اندھیری ہوگئی۔ اب میں ان کے ابّو کو کیا منہ دکھاؤں گی۔؟''

یہ ریگستانی ڈاکو اسی طرح کبھی رات کے اندھیرے میں، کبھی دن کے اجالے میں ریگ زاروں میں سفر کرنے والے بے گناہ کمزور اور بے بس مسافروں پر حملہ کر کے ان کے سامان کو لوٹتے اور آخر میں صحت مند خوبصورت اور کام کے لائق مردوں کو اپنے ساتھ اُٹھا کر لے جاتے اور بڑی بڑی منڈیوں میں ان کی تندرستی، دل کشی اور خوبی کو اجاگر کر کے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرتے تھے ـــــ لوگ باگ اس طرح کی منڈیوں سے غلاموں کو خرید کر جہاں اس سے من چاہا گھریلو اور بازارو کام لیا کرتے تھے، وہیں زر خرید لونڈیوں سے اپنے عشرت کدے کو سجا کر، ان سے قحبہ گری اور گانے بجانے جیسے کام لے کر اپنی کمائی میں روز افزوں اضافہ بھی کیا کرتے تھے۔

ریگستانی ڈاکو، ریگستانی منڈی میں زید کو بھی لے آئے تھے۔ خریدار آتے اور جاتے رہے۔ حالانکہ زید صرف آٹھ سال کا تھا۔ معصوم اور ہنس مکھ سبھوں کی آنکھوں کا مرکز.....ایک شخص کو پہلی ہی نظر میں اس کی معصومیت بھا گئی۔ اس پر ترس آ گیا۔ مناسب قیمت ادا کر کے وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ اور اپنی پھوپھی جان کو پیش کر دیا۔ انہوں نے دل و جان سے اسے قبول کر لیا جیسے انہیں کوئی بیش بہا خزانہ مل گیا ہو.....بولیں۔

کتنا پیارا بچّہ ہے۔ یہ بھی کسی ماں کا لاڈلا ہے.....آہ بے چاری اس کے غم میں کس طرح گھلتی ہوگی۔''

یہ گھر پہلے سے ہی اس پورے علاقے میں عزّت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ شروع شروع میں زید کو اپنے والدین کی یاد بہت ستاتی تھی۔ لیکن ان یادوں کو آہستہ آہستہ مندمل کر دیا تھا۔ اس گھر کے پیار نے.....پھوپھی تو اُسے بے حد چاہتی تھیں۔ اور ان کے محبوب شوہر نے بھی ایک غلام کو علی الاعلان بیٹا بنا کر والدین سے بچھڑ جانے کے غم

کو پوری طرح سے ہلکا کر دیا تھا —— زید غلام ہو کر بھی آزاد تھا۔ انسانی غلامی کی تاریخ میں کسی غلام کی آزادی کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس لئے اس فیصلے پر ساری دنیا حیران تھی۔

عمر کا سولہواں سال ہے۔ دوران حج وہ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول ہے کہ تبھی چند ایک لوگ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے حیران کن نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں زید بھی انہیں دیکھ لیتا ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف تیزی سے بڑھ گئے۔ اور پھر بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

'اوہ —— یہ تو زید ہے۔''

''ہاں میں نے بھی آپ لوگوں کو پہچان لیا ہے۔''

''ابھی کہاں ہو —— ؟''

''محبوب ترین شخص کے یہاں اور اچھا ہوں۔''

پھر دونوں کے درمیان باتوں کا ایک لمبا جال پھیلا۔ ''ابّا کیسے ہیں۔؟ امّی کی طبیعت ان دنوں کیسی ہے۔؟ اور وہ کیسے ہیں۔؟ ان کا کیا حال ہے۔؟ بتانے والے نے بہت ساری باتوں کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ تمہارے ابّو جان تمہارے بچھڑ جانے کے غم میں رات دن پاگلوں کی طرح شعر کہتے رہتے ہیں پھر شعر پڑھ کر سناتے ہیں۔ ہر شعر میں زندگی کی تلاش کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کو پانے اور اپنے جگر کے ٹکرے کو اپنے سینے سے لگانے کی ایک ایسی تمنّا ہوتی ہے جو ندی کے بہاؤ کی طرح ہمیشہ اپنا سفر جاری رکھتی ہے —— والد کا حال سن کر زید کا حال بُرا ہو گیا۔ والدین سے ملنے کے لئے اس کا دل بے چین ہو اُٹھا۔ آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور وہ آنسو پوچھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''زید زندہ ہے....'' جب یہ خبر ان کے والدین تک پہنچی تو ان پر شادیءمرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اپنے بیٹے کو جلد سے جلد دیکھنے اور پانے کی تمنّا میں ان کے والد فوراً ضروری سامان اور فدیہ کی رقم لے کر اپنے بھائی کے ساتھ گھر سے نکلے اور ریگستانوں کی خاک چھانتے ہوئے جب ان کے گھر پہنچے تو انہیں وہاں پہنچ کر ایک گونا گوں راحت کا احساس ہوا۔

''اے محبوب ترین شخص! ہم آپ سے صرف اپنے بیٹے زید کی آزادی چاہتے ہیں۔ اس کے لئے جس قدر فدیہ چاہیں، ہم ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔؟''

کیا آپ اس کی آزادی کے سوا کسی اور صورت میں بھی راضی ہیں...؟'' محبوب ترین شخص نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

''وہ کون سی صورت....؟'' زید کے والد نے جاننا چاہا۔

میں اسے بلاتا ہوں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے تو میں اسے بلا معاوضہ آزاد کردوں گا۔ اگر وہ میرے پاس رہنا پسند کرے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہے اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔''

''یہ تو آپ نے انصاف سے بڑھ کر بات فرمائی۔ بچّے کو بلا لیجئے۔'' زید کے والد کی باچھیں کھل اُٹھیں کہ اس طرح سے تو فدیہ کی رقم بھی بچ جائے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد زید کو حاضر کیا گیا۔ والد اور چچا کو دیکھتے ہی خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ تبھی محبوب ترین شخص نے مسکراتے ہوئے زید سے پوچھا۔

''ان دونوں کو جانتے ہو....؟''

''جی ــــ یہ میرے والد ہیں اور دوسرے چچا ہیں۔''

''تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی....اب تمہیں پوری آزادی ہے۔ چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ....اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔''

محبوب ترین شخص کی باتوں کو سننے کے بعد زید کشمکش کے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے ــــ ایک طرف اس کے والد محترم ہیں جنھوں نے اسے جنم دیا ہے۔ جن کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر خوشی کی ایک انوکھی چمک پیدا ہوگئی ہے ــــ اور دوسری طرف وہ شخص ہے جن کے ساتھ خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس جیسے خریدے ہوئے غلام کو بیٹے کے روپ میں آزاد کر دیا ہے۔

سوچ کا جال اس کے دماغ کے چاروں طرف بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے اور زید اس میں پھنستا ہی جا رہا ہے.....زید کے والد کچھ دیر تک تو حیران رہتے ہیں۔ پر ان

سے رہانہیں جاتا ہے۔وہ کشمکش کے جال سے نکالنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں۔

''جلدی سے ہاں کردواور گھر چلو بیٹا۔تمہاری امّی بڑی بےصبری سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔''

''ہاں،ہاں!تم چاہوتو ان کے ساتھ جاسکتے ہو ـــــ''محبوب ترین شخص نے ان کے والد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دماغ کے چاروں طرف پھیلا سوچ کا جال کشمکش کی گرمی کے باعث پہلے ہی کہیں کہیں سے کمزور ہوگیا تھا۔محبوب ترین شخص کی اس بات کو سنتے ہی ایک پل میں ٹوٹ جاتا ہے ۔اورزید چیخ اُٹھتا ہے

''نہیں!میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔''

آج سے پہلے اپنی بچھڑی ہوئی اولاد کے ذریعہ خوشی کے ایسے موقعے پر ماں باپ کی امیدوں کے محل کو شیشے کی طرح چور چور ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔اس لئے زید کے اس انوکھے فیصلے پر والداور چچا حیران وششدررہ جاتے ہیں۔

''کیاتمہیں آزادی پسند نہیں،جوتم غلامی پر راضی ہو....؟'' تاسُّف اور طیش کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہوکر اُنہوں نے پوچھا۔

اولادِ آدم کی آزادی کا یہ اوّلین اعلان ہے ابّو جان!اس لئے میں اب دنیا میں کسی کو بھی ان پر ترجیح نہیں دے سکتا۔''

زید یہ کہتا ہوا محبوب ترین شخص کی طرف بڑھ گیا۔اوران کے والد بڑے صبر وتحمّل کے ساتھ وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔اور پھر کچھ تاسّف کے بعد ان کی بھیگی اور ناراض آنکھیں نیلگوں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔

لیکن جب آسمانی اُفق پر انہوں نے غلام وآقا کے درمیان صدیوں کی کھینچی ہوئی فاصلے کی لکیر کو یکا یک معدوم ہوتے ہوئے دیکھا تو اُن کی بھیگی آنکھوں کی گہری وادی میں رضامندی کے انگنت جگنوخود بخود چمکنے لگے۔

☆

پیش کش: اردو فکشن ڈاٹ کام

انجمن ترقّی پسند مصنّفین، جمشید پور

کے زیرِ اہتمام

افسانہ نگار

ڈاکٹر اختر آزاد

کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ

''سونامی کو آنے دو''

کی رسم رونمائی

۱۱؍جون ۲۰۱۱ء ، شام ۴؍بجے

مدرس ہوم پبلک اسکول، اولڈ پرولیا روڈ، ذاکر نگر، جمشید پور

زیرِ صدارت: جےَ نندن (کہانی کار، صدر پرگتی شیل لیکھک سنگھ، جھارکھنڈ)

مہمانِ خصوصی: جناب شنکر (کہانی کار ، مدیر ۔ پری کتھا ، دہلی)

اِظہارِ خیال : ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

ڈاکٹر ہمایوں اشرف (شعبہ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ)

جناب اسلم ملک (شعبہ اردو، ورکرس کالج، جمشید پور)

نظامت: : پروفیسر احمد بدر (شعبہ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور)

جنرل سکریٹری

سبھاش چندر گپتا

پرگتی شیل لیکھک سنگھ، جمشید پور